پُل صراط

(افسانے)

محمد بشیر رانجھا

پُل صراط

(افسانے)

محمد بشیر رانجھا

نام کتاب	:	پُلِ صراط (افسانے)
مصنف	:	محمد بشیر رانجھا
صفحات	:	۷۸
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۵۰ روپے
سن اشاعت	:	۱۹۹۶ عیسوی

مکتبہ رانجھا ۔۔۔ چک نمبر ۶۷ جنوبی
تحصیل پھلوال، ضلع سرگودھا

انتساب

میرے مخلص دوستوں کے نام

فہرست

اِحساس

O

وہ یادگار سے گاڑی میں سوار ہوا اور ایک کونے میں کھڑکی والی سیٹ پر جا بیٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جب گاڑی کچہری کے سٹاپ پہ پہنچی تو ویگن میں رش ہو گیا کیونکہ اس وقت سکولوں اور کالجوں میں چھٹی ہو گئی تھی۔ ایک لڑکے کو اندر جگہ نہ ملی تو وہ دروازے کے ساتھ لٹک گیا۔ اس نے جب لڑکے کو دروازے کے ساتھ لٹکتے ہوئے دیکھا تو وہ سوچنے لگا کہیں یہ گر نہ جائے۔۔۔۔۔ خدا نہ کرے۔۔۔۔۔۔ یہ گر گیا تو پھر کیا ہو گا؟ اس کے ماں باپ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر ڈرائیور نے بریک لگا دی اور جھٹکے کے ساتھ یہ نیچے جا پڑا تو پھر کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔۔ یہ خیال آتے ہی اس نے لڑکے سے کہا۔ بیٹا اندر آ جاؤ۔۔۔۔۔۔ ویگن بڑی تیز ہے۔۔۔۔۔۔

''نہیں میاں جی! میں یہاں ٹھیک کھڑا ہوں۔ اندر تو پہلے ہی بہت رش ہے۔'' لڑکے نے لاپرواہی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''نا نا پتر! جہاں اتنے لوگ کھڑے ہیں تم بھی اندر گھس آؤ۔۔۔۔۔۔'' اس نے کہا۔ ''کہیں گر نہ جانا۔۔۔۔۔۔''

''بابا جی! آپ میری فکر نہ کریں۔۔۔۔۔۔ میں نہیں گرتا۔''

اس لڑکے کو ذرا بھی ڈر نہیں۔۔۔۔۔۔ ویگن کتنی تیز ہے۔ مجھے تو اندر بیٹھے بھی خوف آ رہا ہے۔ یہ لڑکا کتنا بے حس ہے۔ اگر گر گیا تو اسے کتنی چوٹیں آ سکتی ہیں۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگا۔

''بیٹا! ویگن ذرا آہستہ چلاؤ...... دیکھتے نہیں لڑکا دروازے کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔'' اس نے ڈرائیور کو متوجہ کرتے ہوئے کہا لیکن ڈرائیور نے اس کی بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف سیٹ پر ایک بچہ بیٹھا تھا۔ اس نے بچے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور جب بچے نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا تو وہ اس کی نقل اتارنے لگا۔ یہ دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔

اچانک ویگن کے سامنے شاید کوئی چیز آ گئی۔ ڈرائیور نے زور کے ساتھ بریک لگائی اور اس کا سر اگلی سیٹ پر جا لگا۔ اسے فوراً لڑکے کا خیال آیا جو بڑے اطمینان سے دروازے کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ پھر اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اسے بہت غصہ آیا۔ ڈرائیور نے ویگن کی رفتار پھر بڑھا دی تھی۔ اس نے سوچا...... ہو سکتا ہے لڑکے کو اپنی اس خطرناک حرکت کا احساس ہی نہ ہو...... یہ گر بھی سکتا ہے۔ اس نے دوبارہ ڈرائیور سے کہا۔

''بیٹا! ذرا آہستہ چلو! باہر ایک لڑکا دروازے کے ساتھ لٹکا ہوا ہے......''

ڈرائیور نے سر پیچھے جھکا کر دیکھا اور ہارن بجاتے ہوئے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ وہ سوچنے لگا مجھے دوبارہ اس لڑکے کو سمجھانا چاہیے...... اس نے سوچا کہ وہ لڑکے سے کہے کہ تمہیں احساس کیوں نہیں ...... تو نے اپنی فکر مجھے کیوں سونپ دی ہے......

اس کا دل خوف اور افسردگی کے ملے جلے جذبات سے تیز دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی زبان خشک ہوتے ہونٹوں پر پھیری اور لڑکے کو دیکھنے لگا۔ جو بڑے سکون کے ساتھ

باہر کی دنیا کے منظر میں گم تھا۔

اس نے اپنی توجہ ہٹانے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔اس سے اگلی سیٹ پر ایک شخص بیٹھا بڑے انہماک سے اخبار پڑھنے میں محو تھا۔اس کا شاید دماغ چل گیا ہے۔پہلے ہی عینک لگا رکھی ہے پھر بھی اسے احساس نہیں ……پاگل نہ ہو تو…… اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ اگر چلتی بس میں پڑھیں تو نظر خراب ہوتی ہے……پاگل!

دوسری طرف ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے چہرے پر دھوپ پڑ رہی تھی۔یہ ویگن والے کتنے کمینے ہیں۔بھلا ویگن میں پردے ہی لگا دیتے……کرایہ تو ہر روز اپنی مرضی سے بڑھا لیتے ہیں لیکن انہیں سواریوں کی سہولت اور تکلیف کا احساس تک نہیں۔

ویگن ایک جگہ رک گئی۔شاید کچھ مزید سواریاں تھیں۔انہیں ویگن میں ٹھونس کر کنڈیکٹر نے زور سے ویگن کی باڈی پر ہاتھ مارا اور ویگن ہوا سے باتیں کرنے لگی تو اسے فوراً باہر لٹکے ہوئے لڑکے کا خیال آ گیا۔جو باہر کسی چیز کو دیکھ کو خوش ہو رہا تھا۔……"آہستہ چلو بیٹا……جب یہ گر پڑے گا تو پھر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا……"اس نے ڈرائیور کو ناصحانہ انداز میں کہا۔

اسے خیال آیا کہ کچھ برس پہلے ایسے ہی ایک لڑکا دروزے کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔بس میں زیادہ رش بھی نہیں تھا کہ ڈرائیور نے زور سے بریک ماری تھی……شاید گاڑی کے آگے کوئی چیز آ گئی تھی……لڑکے کا ہاتھ ڈنڈے سے چھوٹ گیا اور وہ سر کے بل زمین پہ جا لگا تھا……بیچارے کا سر پھٹ گیا تھا……اس نے ڈرائیور کو پھر ٹوکا…… "سنتے نہیں ہو؟ ویگن آہستہ چلاؤ۔تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ لڑکا دروازے کے ساتھ لٹکا

ہوا ہے......" اس کے کفقدرے درشت لہجے کی کاٹ کو شاید ڈرائیور نے بھی محسوس کیا اور اس نے گھور کر اس کے منہ کی طرف دیکھا اور گاڑی ایک چوک میں روک لی۔

باہر لوگ ریڑھیوں کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے اور ریڑھیوں والے زور زور سے آوازیں لگا رہے تھے۔ یہ تو ایسے آوازیں دے رہے ہیں جیسے لوگ ان سے ڈرتے ہوں۔ ایک ریڑھی پر گنڈیریاں تھیں تو دوسری طرف حلیم بک رہا تھا...... حلیم کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پتہ نہیں یہ حلیم کیسا پکاتے ہیں؟ نہ برتن دھوتے ہیں نہ ہاتھ صاف کرتے ہیں...... ویگن کے اندر ایک بھٹے بیچنے والا آ گیا...... اس نے اس سے ایک بھٹا خریدا اور اس کے دانے اتار اتار کر کھانے لگا۔

ڈرائیور نے دوبارہ گاڑی چلائی اور رفتار بڑھا دی...... اسے پھر لڑکے کا خیال آیا گیا جو باہر لٹکا ہوا ہچکولے کھا رہا تھا اور اب تو وہ سردی سے کانپنے بھی لگا تھا۔

وہ لال پیلا ہو کر چیخا "...... آہستہ چل اوئے! دیکھتا نہیں کہ لڑکا سردی سے کانپ رہا ہے......"

ڈرائیور نے ویگن روکی اور کنڈیکٹر کی طرف غصے سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"اس نے کیا "لڑکا گرنے لگا ہے"...... "لڑکا گرنے لگا ہے" کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اسے اس کا کرایہ واپس کرو اور ویگن سے نیچے اتار دو......" اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "تم نے لوگوں کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ یہ تیرا باپ لگتا ہے۔ جس کی فکر تمہیں لگی ہے یا یہ تمہارے ماے کا پتر ہے...... لٹکا کوئی ہے اور تم پریشانی میں تنگ ہوتے جا رہے ہو...... چل اوئے...... دفعہ ہو...... نیچے اتر!"

کنڈیکٹر نے نفرت اور حقارت کے ساتھ دو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر

رکھا اور اسے بازو سے پکڑ کر ویگن سے نیچے دھکا دے دیا۔۔۔۔۔گاڑی میں سوار تمام لوگ ۔۔۔۔۔کچھ دلچسپی کے ساتھ اور کچھ حقارت کے ساتھ یہ تماشا دیکھنے پر مجبور تھے۔

''پتر۔۔۔۔پتر۔۔۔۔اوئے پتر۔۔۔۔میری بات سن!'' اس نے ویگن کے ڈنڈے کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔اتنے میں ڈرائیور نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔۔۔۔وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور جھٹکا لگنے سے زور کے ساتھ سڑک پر جا گرا۔اس نے باہر لٹکے ہوئے لڑکے کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جو طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے گھور رہا تھا۔تھوڑی دیر یوں ہی پڑے پڑے اس نے اپنی قوت مجتمع کی اور کپڑے جھاڑتے ہوئے کچھ افسردہ، غمگین اور پریشان سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔اسے توقع ہی نہ تھی کہ چند لمحوں میں اس کے ساتھ اتنا کچھ ہو جائے گا۔۔۔۔''ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔۔۔۔اللہ ہی بچائے۔۔۔۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔وہ گر ہی نہ پڑے۔۔۔۔اس کے ماں باپ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔اس کی ماں دروازے میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔۔۔۔اس کی بہنیں اس کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔۔۔۔بابے کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔۔۔۔

''یا اللہ! اس لڑکے کو گرنے نہ دینا۔۔۔۔اسے اپنی حفظ و امان میں رکھنا'' اور چھوٹے چھوٹے، تھکے تھکے قدموں سے سٹاپ کی چل پڑا۔

O

لمبی اڈاری

O

اس نے سرمہ دانی بند کر کے سنگھار میز پر رکھی اور آئینے کے ذرا اور قریب ہو کر اپنے آپ کا جائزہ لینے لگی۔ بھوری آنکھوں میں ہنستے سرمے کو دیکھ کر وہ خود بھی ہنس پڑی اور سرمئی بالوں کے جوڑے کو پکڑ کر اس کے بند کھولتے ہوئے اس کے گال از خود لال ہو گئے اور سونے کی بالیوں کو کانوں میں گھماتے گھماتے وہ خود بھی سوچوں کی گھمن گھیری میں ڈوب گئی۔

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا...... روزانہ نت نئے کپڑے اور گہنے پہن کر وہ آئینے کے سامنے بیٹھ جاتی۔ ہر زاویئے سے اپنے آپ کا جائزہ لیتی اور آئینہ بھی کبھی جھوٹ اور کبھی سچ اس کی تعریف کرتا ہی رہتا...... ایسے لگتا تھا کہ اسے بننے سنورنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہوتا...... چوہدری مراد علی کی اکلوتی بیٹی شہناز اختر کو اس سے بڑا کام اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن اتنا دانا اور عقلمند چوہدری مراد علی نجانے یہ بات کیوں نہیں سمجھتا تھا کہ اس عمر کی لڑکیوں کو زیورات اور کپڑوں کے ساتھ ساتھ ایک ایسے ساتھی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو ان چیزوں کو دیکھ کر انہیں آسمانوں کی بلندی پر بھی لے جائیں...... اگر ایسا نہ ہو سکے تو سمجھدار ماں باپ آئینہ بھی ان سے چھپا لیتے ہیں۔

شہناز اختر کی عمر بائیس سال ہو گئی تھی اور اس کی ہم عمر لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئی تھیں لیکن زیادہ غریب اور زیادہ امیر لوگوں کی بیٹیاں نجانے کیوں اس انتظار میں ہی بڑھاپے کی دہلیز پہ جا پڑتی ہیں...... وہ بھی اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی

جس کے نام نہری اور بارانی زمین کے علاوہ لاکھوں کا جہیز بھی تھا۔۔۔۔۔دوسرے اس کی کون سی سگی ماں تھی جو اس کی عمر کے ماہ و سال کا انگلیوں کی پوروں پہ شمار کرتی اور پھر انگلی منہ میں ڈال کر فکر کی کسی گہری اور اتھاہ گہرائی میں ڈوب جاتی۔

شہناز چھوٹی سی تھی جب اس کی ماں کے گھر ایک بیٹا چند لمحوں کے لئے آیا اور اس پہ اپنا حق جتا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے گیا اور شہناز کتنے ہی دِن چپ چاپ ماں کے کپڑوں اور دوسری چیزوں میں اسے تلاش کرتی رہی۔ماں کے پیار کی خوشبو اس حویلی کے ہر کونے سے آتی لیکن جانے والے جیسے کبھی لوٹ کر نہیں آتے اس کی ماں بھی کبھی واپس نہ لوٹی۔۔۔۔۔اپنی اتنی خوبصورت گھر والی کے مرنے کے بعد چوہدری مراد علی کتنے ہی دِن گم سم رہا لیکن پھر حویلی کے بجائے اس کی بیٹھک سجنے لگی۔اماں جیناں کو چوہدری کا حکم تھا کہ شہناز کو حویلی کے باہر کی طرف کبھی نہ آنے دے۔کیونکہ دنیا کی رنگ رلیوں میں ڈوبا ہوا کوئی بھی انسان اپنی بیٹی اور بہن کو کھلے عام نکلتے پسند نہیں کرتا۔۔۔۔لوگ کہتے تھے کہ چوہدری اپنی گھر والی کی وفات کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔اسی لئے تو اس نے دوسری شادی نہیں کی۔لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ گھر والی کے مرنے کے بعد وہ کتنے سکون میں ہے۔۔۔۔۔کچہری اور تحصیل کے چکر لگانے اور بیٹھکیں سجانے کے علاوہ اگر اس کے پاس وقت بچ جاتا تو وہ گھر کا چکر بھی لگا لیتا اور مائی جیناں اور بر کتے کو شہناز کا خیال رکھنے کا کہہ کر پھر بے خبر ہو جاتا۔۔۔۔۔شہناز اس کے کاموں سے بے خبر صبح شام اس کا انتظار کرتی رہتی۔۔۔۔۔

پھر وہ بڑی ہو گئی اتنی بڑی کہ بغیر کچھ بتائے وہ چوہدری کی بیٹھک کا راز

جان گئی ...... چوہدری جب بھی گھر آتا وہ بڑی سی چادر کی بکل مار کر اسے سلام کرتی اور ایک طرف ہو جاتی۔ چوہدری نے بھی کبھی اس کے سر پر پیار کا ہاتھ نہیں رکھا...... اس کا پیار تو بس اتنا تھا کہ جب بھی شہر سے واپس لوٹتا تو اس کے لئے اچھے اچھے کپڑے اور نئی نئی اشیاء خرید کر لاتا اور یہ سوغاتیں اس کے حوالے کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا...... یا شاید بُری عورتوں کی صحبت میں رہ رہ کر وہ بھی اسے ایسا ہی سمجھتا تھا...... اور اس کی بیٹی بھی ان کپڑوں اور زیورات کو پہن پہن کر آئینے کے سامنے بیٹھی ...... ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے بابل اساں اڑ جانا ...... ساڈی لمبی اڈاری...... گاتی رہتی۔ اس کی ساری سہیلیاں نجانے شادی کے بعد کہاں کہاں چلی گئی تھیں...... اس لئے اسے ملنے کے لئے بھی کبھار ہی چکر لگاتیں۔ گاؤں کی لڑکیاں سسرال یا میکے آتے جاتے اس کے پاس چند گھڑیوں کے لئے چکر لگاتیں تو اس کا دل بہل جاتا لیکن ان کے بے ڈھنگے جسم اور گود میں بچے دیکھ کر اس کا دل نجانے کیوں اداس ہو جاتا اور وہ میٹھے سپنوں کی وادی میں کھو جاتی اور چپ چاپ "ساڈا چڑیاں دا چنبہ" گا کر دل کو خوش کر لیتی۔

سارا دِن مائی جیناں، بَرکتے اور رَجو کی شکلیں دیکھ دیکھ کر وہ اُکتا سی گئی تھی...... چوہدری کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے باہر بھی نہیں جاسکتی تھی۔ بس سارا دِن گھر میں ایسے پھرتی جیسے کچھ تلاش کرتی پھرتی ہو یا شاید اس نے اپنی جوانی کے لمبے اور پھیکے دِن گزارنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا...... لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دِن کاٹنا مشکل ہو جاتے ہیں اور سال چپ چاپ بیت جاتے ہیں...... شہناز اختر بھی جوانی کے دِن گنتی رہی اور سال چپ چاپ اس کے ہاتھوں سے ریت کی

مانند سرکتے گئے۔ اس گزرتے وقت نے نہ تو چوہدری پر کوئی اثر کیا اور نہ ہی شہناز پر ...... لیکن اتنا ضرور ہوا کہ سپنے دیکھنے والی آنکھوں کے اردگرد کالے رتجگوں کی سیاہی اتر آئی تھی۔

پھر ایک دِن ''شریکے'' کی نصیحت پھٹکار سے خوفزدہ اور شرمندہ ہو کر چوہدری نے اس کی منگنی اپنے بھائی کے نیم پاگل بیٹے سے طے کر دی جو کئی ملوں اور کارخانوں کا مالک تھا۔ شہناز نے چچا کے اس بیٹے کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ یہ منگنی صرف اس لئے ہوئی تھی کہ گھر کی زمین گھر میں ہی رہے۔ اپنی اس بے جوڑ منگنی کا سُن کر شہناز کتنے ہی دِن کمرے سے باہر نہ نکلی۔ اندر بیٹھ کر روتی رہتی۔ نہ کپڑے بدلتی نہ سر میں تیل لگاتی اور نہ ہی آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو سنوارتی ...... شاید اس کے کنوارے سپنے بھی آنسوؤں کے سیلاب کی نذر ہو گئے تھے اسی لئے وہ خالی نظروں سے اپنے کمرے کی چھت کی کڑیاں گنتی رہتی ...... ہائے او میریا ربا! میں بھی کسی غریب کے گھر پیدا ہوئی ہوتی ...... یہ بات اس نے کتنی بار سوچی۔

ایک ڈھلتی شام وہ صحن میں بیٹھی تھی کہ باہر سے آواز آئی ...... بی بی جی! پانی آ گیا ...... مائی جیناں اپنی بیٹی کے پاس دوسرے گاؤں گئی ہوئی تھی اور بر کتے اور رجو نجانے کہاں تھیں ...... وہ چپ رہی ......

پانی آ گیا جی!'' سقے نے جب تیسری بار آواز دی تو اس نے چادر سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

چاچا اندر آ جاؤ ...... اس نے چادر کی اوٹ سے دیکھا کہ گھڑوں کے پاس چاچا ''دِتو'' تو نہیں تھا اور نجانے کون شڑپ شڑپ گھڑے بھرے جا رہا تھا۔ اس نے

چادر کو تھوڑا اور کھسکایا۔ میلی سی لنگی اور پرانی بنیان میں اس کا جوان جسم پھنسا ہوا تھا...... مضبوط پٹھوں میں مشکیزے کی پٹی بری طرح چبھی جا رہی تھی اور اس کی چھاتی کے کالے بالوں پر چمکنے والے پسینے کے موتی دیکھ کر وہ نجانے کیوں شرما سی گئی...... لیکن پھر بھی اس نے بڑے رُعب سے پوچھا...... تم کون ہو؟...... چچا ''دِتو'' کہاں ہے؟'' پانی بھرنے والا یکدم مڑا...... بی بی جی! ابا کل کا پردیس گیا ہے...... اسی لئے میں پانی دینے آیا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گیا...... اور اس رات شہناز کے سپنوں میں ایک دفعہ پھر شعلے سے لپکتے رہے...... پہلی دفعہ اس کے خوابوں میں بسنے والے ہیولے کو شکل مل گئی...... ساری رات وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ دعا مانگتی رہی...... میرے مولا! چاچا ''دِتو'' اَب کبھی پردیس سے نہ لوٹے۔

اگلے روز شام سے پہلے ہی اس نے رَجو اور برکتے کو اِدھر اُدھر بھیج دیا...... '' پانی آ گیا جی'' کی پہلی آواز پر ہی اس نے ''اندر آ جاؤ'' کہہ دیا...... اُس کا دِل نجانے کیوں اُس کی پسلیوں کے ساتھ ٹک ٹک بجنے لگا تھا...... آج بھی چاچا ''دِتو'' نہیں آیا تھا اور اس کا بیٹا گھڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ شہناز نے جلدی سے گلاس لیا اور ''رَمضُو'' کے مشکیزے کے سامنے کر دیا۔

چاچا کب لوٹے گا؟ اُس نے خود ہی پوچھ لیا۔

پانچ چھ روز شاید مزید لگ جائیں...... رَمضُو نے جواب دیا اور مڑ کر گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔

اُس کے جوان جسم کی خُوشبو شہناز کے دِل و دماغ پر نشہ طاری کر گئی۔ اُس

نے جلدی سے پانی کا بھرا ہوا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ رَمضُو چلا گیا لیکن پہلی دفعہ کسی جوان جسم کے احساس نے اُسے پاگل کر دیا...... وہ چارپائی پر بے سدھ سی ہو کر گر گئی اور اس کی بند آنکھوں میں نجانے رَمضُو اپنے مشکیزے سمیت کس وقت آ گیا تھا۔

اَب یہ روز کا معمول بن گیا کہ وہ رَجو کو باہر نکال کر مائی کو کسی کام میں لگا دیتی اور خود کسی نہ کسی بہانے تھوڑی دیر کے لئے رَمضُو سے کسی نہ کسی موضوع پر بات چیت کر لیتی۔ لیکن دو جوان جسم کتنی دیر بے مقصد باتیں کر سکتے ہیں۔ رمضو بھی جوان اور ارمانوں بھرے دِل کا مالک تھا...... اس کی نگاہیں بھی راہ سے بھٹک گئیں۔ اَب یہ دو گھڑی کی ملاقات آنکھوں کو ٹھنڈک دینے کے بجائے دِل کی آگ کو کچھ اور بھڑکا دیتی۔ جسے بجھانے کے لئے وہ چھتیں پھلانگتا ہوا چوہدری کے چبارے پہ پہنچ جاتا اور پھر ہجر کی لمبی راتیں وِصال کے لمحوں میں یوں گزر جاتیں کہ انہیں پتا ہی نہ چلتا...... ایک لمبے اِنتظار کا نیا دِن دَرمیان میں آجاتا جسے گزارنے کے لئے شہناز سارا دِن اندر باہر چکر لگاتی رہتی۔

اُن دِنوں چوہدری تاریخ بھگتانے شہر گیا ہوا تھا...... شہناز کو کھلی چھٹی مل گئی...... چوہدری گھر ہوتا تو بھی وہ اُس کے پاس کہاں ہوتا تھا لیکن چوہدری کے غصے سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ حالانکہ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر عام کپڑے پہنا کر اسے گاؤں کی دوسری کسی لڑکی کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو اُس کا باپ اُسے پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ اَب تو ایسے لگتا تھا کہ وہ اپنی پہچان ہی بھول گئی تھی۔ اُس کی پہچان تو رَمضُو بن گیا تھا جو اس کے اکیلے پَن کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کے دُکھ درد سُن

کے پیار کے میٹھے بولوں سے اُسے تسلی دے کر باقی سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیتا۔

اُس دِن وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر کپڑوں کو پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی کہ چوہدری کے ہنکارا ابھرنے کی آواز آئی۔اُس نے جلدی سے پلنگ پر پھیلے کپڑوں پر سفید چادر پھیلا دی------شہناز بیٹا!------باہر سے چوہدری نے آواز دی------پہلی دفعہ اپنے باپ کی پیار بھری آواز سن کر وہ باہر نکلی------چوہدری نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سامنے چارپائی کی طرف اشارہ کیا------شہناز!اِسے ملو------یہ تمہاری نئی ماں ہے------

شہناز نے دیکھا------بہت سے زیورات سے لدی پھندی اس کی ماں عمر میں اس سے بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔اُس نے ایک نظر اپنی جوان ماں کی طرف دیکھا اور چوہدری کا ہاتھ جھٹک کر واپس کمرے میں بھاگ گئی------آنسوؤں کا ایک سیلاب نجانے اُس کی آنکھوں میں کیسے اُمڈ آیا اور وہ اپنی ماں کے زیورات کا ڈبہ کھول کر بیٹھ گئی۔ماں کے زیور دیکھ کر وہ ایسے رونے لگی جیسے اُس کی ماں ابھی مری ہو۔

چوہدری مراد علی کے ہاں سارا دِن لوگوں کا میلہ لگا رہا۔گاؤں کے سب لوگ نئی دلہن کو دیکھنے کے لئے آتے رہے------اللہ بھاگ لائے------اِن زمینوں کے وارث دے------مراثیوں اور نوکروں کی دعائیں سن کر چوہدری ہنس ہنس کر ان کے ہاتھوں پر مٹھائی اور پیسے رکھتا رہا اور دوسری طرف شہناز اپنے کمرے میں روتی بلکتی رہی۔

سُورج ابھی پوری طرح نکلا نہیں تھا------چوہدری اپنے خضاب آلود بالوں کو تولیے سے آہستہ آہستہ پونچھتے ہوئے صحن سے گزرا تو کہیں سے بلی کا ایک بچہ بھاگتا

ہوا آیا اور دروازے کی طرف باہر نکل گیا۔ اتنا سویرے یہ دروازہ کس نے کھولا ہے؟ اَدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھ کر چوہدری نے جا کر دروازے کی کنڈی چڑھائی اور صحن میں کھڑا ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا...... مائی جیناں نجانے نیند میں کیا بڑبڑائی۔ چوہدری نے پیچھے مڑ کر دیکھا...... صحن میں تین چارپائیاں بچھی تھیں...... رجّو اور جیناں اپنی اپنی چارپائیوں پر بے خبر سو رہی تھیں۔ اُن کے درمیان کی خالی چارپائی دیکھ کر چوہدری نجانے کیوں کانپ سا گیا۔ وہ جلدی سے شہناز کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے لالٹین کی مدہم روشنی میں دیکھا کہ شہناز کی ماں کے زیورات والا ڈبہ خالی پڑا تھا...... اور صحن میں بچھی اُس کی چارپائی کی سفید چادر نجانے کیوں ہنس رہی تھی۔

O

پُل صراط

O

تیز ہوا کے ساتھ کھڑکھڑاتے پتے اس طرح لگتا تھا کہ جیسے وہ ٹہنیوں سے آزاد ہو جانا چاہتے ہوں۔کھڑکھڑاتے پتوں کی آواز کبھی ہنسی اور کبھی بین کی صورت اختیار کر جاتی......شاید یہ میرے دل کی حالت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر رہے تھے......دھوپ چھاؤں کی طرح بدلتی ہوئی حالت......ماں سویٹر بن رہی تھی......اس کی انگلیاں پتوں کی طرح کانپ رہی تھیں۔ماں نے کن انکھیوں سے میری جانب دیکھا۔

عاشی!

جی......امی جی!

خالہ جیراں، آج ایک نیا رشتہ لے کر آئی تھی۔

آج پھر ایک نیا رشتہ......؟

لڑکے کی تصویر بھی لائی تھی......ٹھہرو! میں لے کر آتی ہوں۔

میں نے فوٹو کا اچار ڈالنا ہے؟......امی جی! اب یہ روز روز کا مذاق بند ہی کر دیں......میں نے جلدی سے کہا۔

کون سا روز روز کا مذاق......؟

یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ ہر تیسرے چوتھے دِن......کوئی نہ کوئی نیا رشتہ......

تیرا کیا مطلب ہے......ساری عمر ایسے ہی کنواری دہلیز پہ بیٹھی رہے

گی؟......تیس برسوں کی تو ہو چلی ہو......اور کب تک یہ چلے گا؟

ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری......یوں لگتا تھا کہ اب رو پڑے گی۔

امی جی! آپ بھی حد کر دیتی ہیں......آپ خود ہی سوچیں......خالہ جیراں اب تک ہوئی ڈھنگ کا رشتہ لائی ہے؟ کبھی کسی بابے کا رشتہ لاتی ہے تو کبھی کسی کاکے کا......کوئی بہت ہی ڈبلا ہوتا ہے تو کوئی بہت موٹا......میں نے ماں سے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

عاشی!

جی......امی جی!

اگر تمہاری کوئی اور پسند ہے تو......ماں کی بات سن کر میری ہنسی نکل گئی۔

امی جی......آپ بھی بس......میں نے آپ سے پہلے بھی کتنی بار کہا ہے کہ میں نے اس وقت تک شادی نہیں کرنی جب تک میرے بعد اس گھر کا کوئی آسرا نہیں بن جاتا۔

'کاشی تو چھ سات سال بعد تک کچھ کھانے کمانے کے قابل ہو گا......اس وقت تک تو......ماں کچھ کہتی کہتی رُک گئی۔

اس وقت تک تو......کیا امی جی؟

ماں کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے اُتر آئے۔

میں کہہ رہی تھی......اس وقت تک تو صائمہ بھی جوان ہو جائے گی......اور تم......تم میری مانو......تیری شادی کر دیتی ہوں اور کاشی کو کسی کام پر لگا دیتی ہوں۔

لگتا تھا کہ ماں کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

نہیں امی جی! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ بس چھ سات سال کی تو بات ہے۔ اور آپ خود سوچیں کہ میرے جتنی تنخواہ وہ کس کام سے لائے گا۔۔۔۔بس اور کچھ نہ کہنا۔

اللہ بخشے اگر تیرا بہشتی باپ زندہ ہوتا تو اب تک تو اپنے گھر بار والی ہو چکی ہوتی۔ جب اپنی مجبوریوں کی طرف دیکھتی ہوں تو چپ کر جاتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ویسے بھی جب بیٹیوں کی کمائی پر گزارہ کیا جائے تو خاموش ہی رہنا پڑتا ہے۔

مجھے ایسے لگا کہ کانپتے ہوئے پتے اپنی بے بسی اور مجبوری پہ رو رہے ہوں۔

دفتر آتے جاتے ہوئے گھورتی ہوئی آنکھیں، بجتی سیٹیاں اور چبھتی ہوئی نگاہیں مجھے کتے کی بھونک جیسی لگتی ہیں۔ دفتر جاتے ہوئے کافی دیر تک سڑک کے پل صراط پر چلنے کے بعد کچھ گلیوں سے گزر کر میں بس سٹاپ تک پہنچتی ہوں۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی کے موڑ پر ایک کتا اپنے مالک کے دروازے کے سامنے بیٹھا ہوتا ہے۔

چھوٹے سے قد کا سفید کتا مجھے بہت پیارا لگتا ہے لیکن اُس کی ایک بات بہت بری ہے کہ وہ جب کسی کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھتا ہے تو تیزی کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہو کر بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔

"بھؤ! بھؤ! بھؤ!"

یہ ڈرپوک کتا کسی کو کاٹنے کی ہمت تو نہیں رکھتا لیکن بھونکنے کی طاقت رکھتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے گھورتے ہوئے لوگ بھی اس کتے کی طرح معلوم ہوتے ہیں...... مجھے اِن کی آوازیں بھی اُس کی آواز کی طرح لگتی ہیں۔

کیا بات ہے عاشی؟ کن سوچوں میں گم ہو؟ ماں نے پوچھا۔

کچھ نہیں امی جی!

کچھ تو ہے!

کچھ بھی تو نہیں...... میں نے چڑ کر کہا۔

میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں...... جب تم باہر سے آتی ہو تو تمہارے ماتھے پہ بل اور آنکھوں میں نمی نظر آتی ہے۔

بس کریں امی جی! دفتر سے تھکی ہاری آتی ہوں...... اوپر سے آپ امتحان لینا شروع کر دیتی ہیں...... ایک کپ چائے کا بنا دیں...... سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے تیزی سے جواب دیا۔

ایک تو آج کل کے بچوں کو یہ درد ہی سانس نہیں لینے دیتے...... اوپر سے تیرا اپنے آپ میں جلتے کڑھتے رہنا۔۔ چائے پینی تھی تو سیدھی طرح کہہ دیتی...... ایسے ہی میری جان سولی پہ چڑھا رکھی تھی۔

ماں یہ کہہ کر چلی گئی۔ لیکن میں نے سوچا...... ہماری جانیں تو ہر وقت سولی پہ ٹنگی رہتی ہیں۔ ہم ہر وقت دُنیا کے پُل صراط پر چلتے ہیں...... سر کے بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز پُل صراط............ جس پر توازن برقرار رکھ کر چلنا پڑتا ہے۔ ہر گلی، ہر موڑ، ہر معاشرہ اور ہر فرد کی اپنی اپنی جگہ پُل صراط۔

گرمی کافی تھی۔ میں اسٹاپ پہ کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کے دو لڑکے میرے قریب سے گزرے۔ اُن کے چہروں اور آنکھوں پر وقت جھلکارے مار رہا تھا۔

ایک لڑکا بولا ---- ہائے یہ پھول سا چہرہ اور یہ ظالم دھوپ!

میں قریب کھڑی عورت کی طرف دیکھنے لگی۔

ہونہہ! ---- گھٹیا Taste ---- دوسرے لڑکے کی ہنسی کی آواز آئی ----

چالیس برس کی ماں جیسی عورت کو ---------- اوہ ہو ---- ہو ہو ---- !!!

مجھے ایسا لگا جیسے ہوا رک گئی ہے۔

بس آئی ---- میں جلدی سے سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر جا بیٹھی ---- اور بس چل پڑی۔

مجھے اُس شہزادی کی یاد آئی جسے جادو کے چرخے کا تکلا چبھ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ کئی سال بے ہوش رہنے کے بعد جس وقت جادو کا اثر ختم ہوا تو وہ جاگی۔ جاگنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ مجھے اِیسے لگا جیسے ---- جیسے میں وہ شہزادی ہوں۔

گلی کے موڑ پر وہی کتا بیٹھا ہوا تھا۔

اُس نے کانپتی آواز سے "بھوں ---- بھوں ---- بھوں ---- کیا۔

مجھے ایسے لگا جیسے میں ٹائم پیِش کے الارم کی آواز سن کر جاگ گئی ہوں ----

لیکن کتے کی آواز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ بوڑھا ہو گیا ہے۔

تیز ہوا کے ساتھ کھڑ کھڑاتے ہوئے پتے اس طرح لگتے تھے کہ جیسے تھک گئے ہوں۔

عاشی!

جی امی جی!

اور ایک سال تک کاشی بھی کام کاج کے قابل ہو جائے گا تو میں سب سے پہلے اپنی اس بچی کا-------------- ماں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ماں خوش نظر آرہی تھی۔

کیا بات ہے امی جی!......آج بڑی خوش نظر آرہی ہیں؟

ایسی ہی بات ہے.....خالہ جیراں آج ایک بہت ہی اچھا رشتہ لے آئی ہے۔ ٹھہر میں تصویر لے آتی ہوں۔

ماں تصویر لینے چلی گئی تو میں نے سوچا......پینتیس سال کی لڑکی کے لئے پچاس سال کے بابے کا رشتہ ہوگا۔

ماں نے فوٹو لا کر مجھے دکھائی جو بیس پچیس سال کے ایک نوجوان کی تھی۔ نین نقش بھی خوبصورت تھے۔

میں تصویر پکڑ کر دیکھنے لگی۔

عاشی!

جی امی جی!......میں نے تصویر کو قدرے دھیان سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بتاؤ......کیسا ہے؟

ٹھیک ہی ہے۔

ہماری صائمہ بھی تو خوبصورت ہے؟......ماں نے کہا

میرا ہاتھ کانپ گیا اور تصویر نیچے جا پڑی۔

O

احمد

O

احمد کارخانے میں داخل ہوا تو اُسے ناگوار سی بو سے متلی ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کارخانے میں نہیں اپنے ماسٹر کے جوتے میں گھس گیا ہو۔ کچھ دیر تک وہ اپنی ابکائیاں روکتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ بُو کا عادی ہونے لگا۔ کارخانے میں چھ سات کھڈیاں تھیں جن پر دل فریب رنگوں اور خوبصورت ڈیزائن کے قالین بُنے جا رہے تھے۔ ابھی وہ ملگجے اندھیرے سے مانوس بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ایک دروازے کے برابر والی کھڈی سے آواز آئی۔

''کیوں آیا ہے بے؟...... کیا بات ہے؟''

''کام سیکھنے آیا ہوں''...... اُس نے جواب دیا۔

''کام سیکھنے آیا ہے تو چل پانی پلا گلاس بھر کے'' آواز دوبارہ ابھری۔

احمد نے ٹینکی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا کہ کھڑکی سے آنے والی دھوپ کی دھار میں اُون کے ذرّے تیر رہے تھے۔ وہ دھوپ سے دُور ہٹ گیا مبادا وہ ذرے اُس کی سانس میں شامل نہ ہو جائیں۔ احمد نے گلاس بھرا تو دیکھا کہ پانی میں اُون کا رواں تیر رہا ہے۔ اُس نے گلاس کا پانی انڈیل دیا۔

''پانی کیوں پھینک دیا بے''...... آواز آئی۔

"پانی میں کچرا ہے"۔احمد نے صفائی پیش کی۔

"ابے لندن سے آیا ہے کیا ڈاکٹر کے بچے؟"......دروازے کے سامنے والی کھڈی سے ایک لڑکے نے سر نکالتے ہوئے چلا کر کہا۔

دوسری کھڈی سے آواز آئی......"مارو سالے کو ہماری روزی کو کچرا کہتا ہے"۔

باہر سے بھائی صاحب کی آواز آئی......بہن کے سالو......کانوں میں تار کو ڈال رکھا ہے کیا؟......ہاتھ چلاؤ زبانیں مت چلاؤ......ماں کے......بڑی دیر سے نیچے کی آواز نہیں آئی کیا اپنی ماں ...."

پورے کارخانے میں خاموشی چھا گئی اور اُون کٹنے کی آواز واضح طور پر سنائی دینے لگی۔پھر یکے بعد دیگرے ہر کھڈی سے پنجا ٹھوکنے کی گرج دار آوازیں بلند ہونے لگیں جو گلی میں بھی دُور دُور تک سنی جاسکتی تھیں۔

آنے والے کئی دِنوں تک احمد نے کارخانے میں نہ پانی پیا اور نہ ہی کھڑکی سے آنے والی دھوپ کے قریب گیا۔

احمد کے کام پر لگ جانے کے بعد بھائی صاحب کا رویہ یکسر بدل گیا۔پہلے وہ بیٹا بیٹا کرتے تھے۔اب احمد پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ بھائی صاحب کے دو روپ ہیں۔ایک محلے والوں اور لڑکوں کے والدین کے لئے اور دوسرا کارخانے والوں کے لئے۔کارخانے میں کام کرنے والے لڑکوں سے وہ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔اگر کسی کو کام پر آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی یا کام میں سستی کرتا تو بھائی صاحب نہ صرف گالیوں سے پیش آتے بلکہ پیٹنے میں بھی سستی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔

ایک بار احمد کو کام پر آنے میں دیر ہوگئی۔۔۔۔۔وہ کارخانے پہنچا تو بھائی صاحب نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''سالے! نواب کے بچے۔۔۔۔۔سات بج رہے ہیں۔یہ کام پر آنے کا وقت ہے بھن کے۔۔۔۔۔۔۔میرے پاس حرام کے پیسے ہیں جو آئے مہینے تجھے چالیس روپے دیتا ہوں۔سالے اگر کل دیر کی تو بھڑوے کی کھال اتار دوں گا۔۔۔۔۔کتی کا بچہ۔۔۔۔چل کام پر بیٹھ۔۔۔۔۔۔۔۔''

بھائی صاحب کارخانے سے باہر ہوتے تو ان کا رویہ دوسرا ہوتا۔خاص طور پر لڑکوں کے والدین سے بڑے خلوص سے پیش آتے۔کسی کو سو کی ضرورت ہوتی تو اسے دو سو دینے کو تیار رہتے۔کارخانے کا ہر لڑکا ان کا مقروض تھا۔احمد کی ماں بھی ان سے کئی بار پیسے لے جا چکی تھی۔احمد زیادہ کام کر کے قرض اتارتا تھا مگر کوئی نہ کوئی ضرورت پڑ جاتی اور قرض کی رقم میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

ایک روز بھائی صاحب نے احمد اور خیرو کا مقابلہ رکھ دیا اور اعلان کیا کہ جیتنے والے کو دس روپے انعام ملے گا اور ہارنے والے کو پانچ پنجے جیتنے والا مارے گا۔مقابلہ شروع ہونے سے پہلے بھائی صاحب نے دس روپے کا نوٹ دھاگے میں باندھ کر ان کے سامنے لٹکا دیا۔احمد کو دس روپوں سے زیادہ پنجوں کا ڈر تھا۔ویسے بھی خیرو کی اس سے نہیں بنتی تھی۔اس نے مقابلہ توڑ جی توڑ کر کیا اور وہ جیت بھی رہا تھا مگر ہدف تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انگوٹھا کٹ گیا۔پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔اس کے ہتھے کی تانی خون سے رنگین ہوگئی مگر وہ مقابلہ نہ جیت سکا۔

مقابلہ ہارنے کے بعد احمد نے چار پنجے تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لئے

مگر خیرو نے پانچواں پنجا سیدھا احمد کی کمر پہ جڑ دیا۔اس کی چیخیں نکل گئیں اور خون کی دھاریں پیٹھ سے نکل کر تختے کو رنگین کر گئیں۔

کئی ہفتوں تک وہ سیدھا نہیں ہو سکا۔زخم کی وجہ سے اُسے تین دن کی چھٹی مل گئی۔وہ تین دن احمد کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ان تین دنوں میں اس نے دو فلمیں دیکھیں اور ایک بار ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی..... شہر کے مرکزی علاقے کو دن کی روشنی میں دیکھا..... دوپہر کا کھانا اپنے گھر چارپائی پر بیٹھ کر کھایا اور دیر تک سوتا رہا۔چھٹیاں ختم ہونے کے بعد بھائی صاحب نے اس کی لُوم بدل دی۔اب وہ اصغر کے ساتھ بیٹھنے لگا۔کچھ دنوں تک تو ان میں اجنبیت سی رہی پھر رفتہ رفتہ وہ اصغر سے مانوس ہو چلا گیا۔اُسے اصغر کی دو باتیں پسند آئیں ایک تو وہ بار بار تھوکتا نہیں تھا اور دوسری یہ کہ وہ اسے کوئی نہ کوئی خبر ضرور سناتا تھا۔

’’تجھے پتا ہے کل شہر میں جلوس نکلا تھا‘‘۔

’’نہیں تو؟‘‘

’’آج ہڑتال ہے‘‘

’’کیوں‘‘

’’پتا نہیں.....بس ہے‘‘

’’دلاور جیل سے واپس آ گیا ہے‘‘

’’اچھا.....اُسے جیل میں بند کیوں کیا گیا تھا؟‘‘

’’اس نے دو خون کئے تھے‘‘

’’دو خون؟؟؟‘‘

''ہاں''

''پھر وہ واپس کیسے آ گیا...... پھانسی کیوں نہیں دی اُسے؟''

''پتا نہیں''

احمد اور اصغر کی جوڑی اب کارخانے کی مثالی جوڑی کہلانے لگی۔ان میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کی شکائتیں کرتے تھے۔کام کے لحاظ سے بھی احمد اب پورا کاریگر ہو گیا تھا۔بھائی صاحب نے انہیں ترقی دے کر دروازے کے پاس والی کھڈی دے دی تھی۔احمد اپنے دوسرے ساتھیوں سے بہت کم بات چیت کرتا تھا۔اس کا شاداب جسم اب مرجھانے لگا تھا۔اس کی چمک دار سیاہ آنکھیں اب خاصی میلی اور دھندلی نظر آتی تھیں۔ایک روز اصغر نے کام پر آتے ہی اُسے نئی خبر سنائی۔

''تجھے پتا ہے خیرو کہاں ہے؟''

''پتا نہیں...... کریم بھائی صاحب کے کارخانے میں ہوگا''

کارخانے میں نہیں وہ ہسپتال میں ہے''

''ہسپتال میں!...... وہاں کیا کرتا ہے؟''

''بیمار ہے''

''تجھے کیا پتا''

''میری ماں نے بتایا ہے...... وہ کل خیرو کو دیکھنے گئی تھی۔ماں کہہ رہی تھی کہ خیرو کو ٹی بی ہو گئی ہے''۔

''ٹی بی کیا ہے؟''

''بیماری کا نام ہے.....ماں کہہ رہی تھی اس سے انسان آہستہ آہستہ مرجاتا ہے''۔

''آہستہ آہستہ مرجاتا ہے''......احمد سارا دن اسی ایک فقرے کو دل میں دہراتا رہا اور آدمی کے آہستہ آہستہ مرنے کے مختلف تصورات ذہن میں بناتا رہا۔

اصغر کے پاس آج بھی حسب معمول ایک نئی خبر تھی۔

''آج ہماری گلی میں ایک آدمی مر گیا ہے''

''کیسے مر گیا''

''ہیروئن پیتا تھا''

''لوگ مرنے سے کیوں ڈرتے ہیں؟''

اصغر جواب میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے سے ایک لڑکا نمودار ہوا۔ وہ لڑکا چند لمحے اپنی آنکھیں مچکاتا رہا.....پھر قدم بڑھا کر اندر آ گیا۔

''کیوں آیا ہے بے.....کیا بات ہے؟؟''

''کام سیکھنے آیا ہوں''

''کام سیکھنے آیا ہے تو چل پانی پلا گلاس بھر کے''

احمد نے دیکھا کہ لڑکے کی نظریں کھڑکی سے آنے والی دھوپ کی دھار میں تیرتے ہوئے اُون کے ذرّوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دھوپ سے بچتا ہوا آہستہ آہستہ پانی کی ٹنکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

O

امانت

O

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔وہ بیڈ پر پرسکون لیٹا ہوا تھا۔کمرے میں لگے ہوئے زیرو بلب کی مدھم روشنی نے ماحول کو قدرے پرسکون بنا دیا تھا۔ڈبل بیڈ کے دائیں طرف تپائی پر خوبصورت گلدستہ رکھا تھا اور بائیں جانب کی تپائی پر پانی کا جگ، گلاس اور ایش ٹرے پڑے تھے۔اس کے ہاتھ میں دبے سگریٹ کے دھوئیں کی لکیر بل کھاتی ہوئی چھت سے ٹکرا کر کمرے میں تحلیل ہوئے جا رہی تھی۔وہ مسلسل چھت کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا۔ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو...... چپ چاپ کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح گم سم......ہوا کے کسی تیز جھونکے پر کبھی کبھار کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہل جاتا۔سامنے ہی دیوار سے لگی الماری میں مختلف موضوعات پہ لکھی گئی کتابیں بڑے قرینے سے سجائی گئی تھیں مگر کسی ایک کا بھی عنوان واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے دیوار میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگا دیئے گئے ہوں۔کچھ بڑے اور کچھ......اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور کچھ دیر دھوئیں کو اندر حلق میں اتارنے کے بعد یکدم خارج کر دیا......اس کا ذہن ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔اسے وہ پل یاد آ گئے جب وہ اور شبنم یونیورسٹی کے وسیع

لان میں ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر پیار کی پینگیں بڑھا رہے تھے اور شبنم نے اس سے ایک سوال کیا......

''گل! تمہیں پتا ہے کہ آکسیجن انسان کے لئے کتنی ضروری ہے؟''

''شبنم! تم بھی کبھی کبھی بچوں جیسے سوال کرتی ہو...... بھلا یہ کس کو معلوم نہیں کہ آکسیجن انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو انسان کا زندہ رہنا ناممکن ہے......'' گل نے جواب دیا۔

''اور محبت کے بغیر؟؟''

''پھر تم نے لایعنی بات کردی ناں...... شبنم!''

''گل...... میری نظر میں پیار سے خالی دِل کسی ویران قبرستان سے کم نہیں ہوتا...... اور پیار و محبت سے لبریز دل تو خدا کا گھر ہے......'' شبنم نے بغیر رکے پھر سوال کیا ''تم نے پھول پہ کبھی غور کیا ہے؟''

''جب سے شبنم کو دیکھا ہے تب سے پھولوں پہ دھیان دینا چھوڑ دیا ہے'' گل نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم آج کل اپنے آپ پہ دھیان دینا چھوڑ چکے ہو...... شبنم تو ہمیشہ پھول پر ہی اچھی لگتی ہے ناں؟'' ...... شبنم نے استفہامیہ انداز میں جواب دیا۔

''شبنم! میں بڑے خلوص سے بتا رہا ہوں کہ تمہاری باتوں سے مجھے پاگل پن کی بُو آتی ہے'' ...... گل نے طنز کا تیر چلایا۔

''جب پیار ہوتا ہے تو انسان پاگل ہی تو ہو جاتا ہے'' شبنم نے کہا۔

اچانک کھلی کھڑکی سے بلی نے چھلانگ لگائی اور وہ خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا۔اس نے یکدم لمبی سانس لی اور بلی نے بھی میاؤں میاؤں شروع کر دی۔

ہش......ہش......وہ بلی کو بھگانے کی کوشش کرنے لگا اور بلی اسی کھڑکی سے باہر چلی گئی۔اس نے کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا...... رات کے اڑھائی بجنے والے تھے۔اس نے اٹھ کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں رکھا اور دو قدم آگے چل کر دروازے کے ہینڈل کو نیچے کر کے کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے مقفل ہونے کی وجہ سے نہ کھل سکا۔وہ نا امید ہو کر واپس بیڈ پر لیٹ گیا۔کچھ لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور پھر نیند کے پہلے جھونکے کے ساتھ ہی وہ ساحل سمندر پہ پہنچ گیا۔

"شبنم کیا لکھ رہی ہو؟"

"گل میں اپنا نام تمہارے نام سے منسوب کر رہی ہوں"

"مگر اس ریت پر نام لکھنے سے کیا ہو گا؟ یہ تو چند لمحوں بعد مٹ جائے گا...... پیار کرنے والے تو اپنے نام لوحِ دل پہ نقش کرتے ہیں اور دِل پہ لکھا کوئی طاقت بھی نہیں مٹا سکتی"۔"اس بات پہ مجھے تمہارے ہی شعر یاد آ رہے ہیں......وہ شعر گنگنانے لگی۔

"بس......بس......شبنم! یہ سچ ہے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے تمہارے ہی نام لکھا ہے......میری ہر غزل اور ہر نظم میں تمہارا ہی ذکر ہے...... شبنم! تم جب میری غزل اپنی مدھر آواز میں گنگناتی ہو تمہاری آواز کی لو میری محبت کی شدت کو اور بڑھا دیتی ہے"۔

''حضور کی مہربانی ۔۔۔۔۔نوازش''

پھر وہ دونوں اٹھ کر ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب چلنے لگے۔تیز ہوا کی وجہ سے شبنم کی لانبی سیاہ زلفیں لہرا کر گل کے چہرے کو چھو جاتیں۔۔۔۔۔ اور جب شبنم ایک جھٹکے سے اپنے بالوں کو پیچھے ہٹاتی تو گل کے دِل کے تاروں کے سارے ساز چھڑ جاتے۔

''شبنم! جب تم اپنی زلفیں اپنے چہرے سے ہٹاتی ہو تو مجھے یوں لگتا ہے۔۔۔۔۔''جیسے گھٹا کی اوٹ سے چاند نکل آیا ہو''۔

واہ۔۔۔۔۔واہ۔۔۔۔۔واہ۔۔۔۔۔بس مجھے شاعری نہیں آتی ورنہ میں بھی تمہیں جانے کیا کیا کہہ جاتی۔۔۔۔۔کبھی پنوں کہتی تو کبھی رانجھا۔۔۔۔۔کبھی مجنوں تو کبھی فرہاد۔۔۔۔۔

تیز ہوا کا شور ان کے کانوں کے پردے پھاڑے جا رہا تھا لیکن معتدل موسم کی وجہ سے انہیں بڑا لطف آ رہا تھا۔ریت پر چلتے چلتے تھوڑی دور گئے تو انہیں ایک جوڑا پیار کی وادی میں گم نظر آیا۔لڑکی ڈھیر ساری گیلی ریت اکٹھی کر کے گھر بنانے میں مصروف تھی۔۔۔۔۔اس نے جیسے ہی پاؤں ریت کے گھروندے سے باہر نکالے تو گھر گر گیا جسے وہ دوبارہ بنانے میں مصروف ہو گئی۔یہ دیکھ کر شبنم نے گل سے کہا۔

''گل۔۔۔۔۔گل! دیکھو یہ پاگل لڑکی ریت کا گھر بنا رہی ہے۔۔۔۔۔بیچاری کو شاید معلوم نہیں کہ ریت کا گھر کبھی بھی پائیدار نہیں ہوتا۔اگر بظاہر یہ بن بھی جائے تو اسے مٹتے لحہ بھی نہیں لگتا۔ایک ہلکی سی لہر کی لپیٹ میں آ کر ساری ریت بکھر جاتی ہے''۔

''محبت کے گھر تعمیر کرنا آسان بات تو نہیں؟''۔۔۔۔۔گل اس سے کبھی کبھی

ایسے سوال بھی پوچھتا ہے جن کا جواب وہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ سے ہی دے دیتی ہے۔

''گھر بنانا تو اتنا مشکل نہیں ہوتا لیکن بنانے کے بعد اسے قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے......''

یکدم منظر بدلا اور آسمان پر گہرے کالے بادل چھا گئے......ہلکی بوندا باندی شروع گئی......پھر اچانک بادل زور سے گرجا......اور اسی گرج کی آواز سے گھبرا کر وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔پاؤں میں چپل ڈالی اور کھڑکی کے قریب آ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ بارش تیز ہو چکی تھی اور پانی کے بہاؤ سے گلیاں بھرنے لگی تھیں۔پانی کا تیز بہاؤ دیکھ کر اس کی طبیعت میں بے چینی بڑھنے لگی اور اس کا جسم کانپنے لگا۔وہ بہت زور سے چیخنا چاہتا تھا......ایسی چیخ جو آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جائے لیکن اس کی آواز گلے میں ہی دب کر رہ گئی اور اس کی ٹانگوں میں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا اور ایک زوردار گرج کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔آنسو بے اختیار ہو کر اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

اس کا ذہن ایک بار پھر ماضی میں چلا گیا......ایسی ہی خوفناک بارش اور گرج میں سمندر کی ایک بے رحم لہر نے شبنم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔گل اور شبنم اکٹھے سمندر کے کنارے سیر کے لئے نکلے اور اچانک لہروں سے کھیلتے کھیلتے قدرے گہرے سمندر میں چلے گئے اور پھر گل کی آنکھ ہسپتال کے بیڈ پر کھلی۔

''میں شبنم سے ملنا چاہتا ہوں''......گل شبنم کے بغیر ادھورا ہے۔میری شبنم

مجھ سے جدا نہیں ہو سکتی......میں بھی شبنم سے جا ملوں گا......میں اپنی زندگی ختم کر دوں گا......ہم کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے......"پھر ڈاکٹر نے اس کے عزیز رشتہ داروں سے کہا کہ اسے بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے ذرا سی لاپرواہی یا بے توجہی سے یہ پاگل بھی ہو سکتا ہے"......لہٰذا سارا دِن اس کی نگرانی کے بعد اس کے رشتہ داروں نے رات کے وقت اس کے کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا تھا۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔باہر بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا۔رات بھر اس کا کمرہ آہوں اور سسکیوں سے گونجتا رہا......اب بھی اس کی ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ بھی لہروں کی نذر ہو جاتا اور شبنم کے ساتھ ہی سمندر کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتا......وہ دیوانگی کی آخری حدوں کو چھونے کی آرزو کرنے لگا اور زیرِ لب بڑبڑانے لگا......

"ہاں مجھے موت ہی اپنی شبنم سے ملائے گی"......اس کی آنکھیں پھیلنا شروع ہو گئیں اور اس نے اٹھ کر الماری سے لٹکی ٹائی اٹھائی......وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا......اس نے ٹائی کو گردن کے گرد کسنا شروع کر دیا......لیکن اچانک ہی اس کا ذہن ایک بار پھر یادوں کی دھند میں ہچکولے کھانے لگا......

"Happy Birth Day to you"......پیکٹ میں بند ایک کیک اور ایک دوسرا پیکٹ گھاس پر رکھ کر شبنم تالیاں بجاتی رہی......

"آج......میری......یہ......اوہو! Is today first August?......مگر اس طریقے سے میرا Birth Day منانے کی کیا ضرورت تھی؟......"گل نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"اس کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔گل! زندگی انسان کو ایک مرتبہ ملتی ہے۔۔۔۔کیا اس کو غموں میں گزار دیا جائے۔۔۔۔زندگی کو خوش رہ کر گزارنے کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔۔۔۔"شبنم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے اس موقع پر ایک فلسفی کا قول یاد آ رہا ہے کہ۔۔۔۔اپنی ہر برتھ ڈے پر خوشی و شادمانی کے بجائے رونا چاہیے کیونکہ ہر سال زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے"۔۔۔۔گل نے کہا۔

"مجھے بھی ایک ماہر نفسیات کے یہ الفاظ یاد آ رہے ہیں۔۔۔۔کہ کامیاب زندگی کا راز مسکراہٹ میں پوشیدہ ہے۔۔۔۔گل! زندگی ہنسی خوشی گزارنے کے لئے ملتی ہے نہ کہ آنسو بہانے کے لئے۔۔۔۔خدا بھی اپنے بندے کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔۔۔۔ زندگی اللہ کی امانت ہے۔۔۔۔ اسے خواہ مخواہ کی پریشانیوں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے"۔شبنم نے مسکراتے ہوئے گل کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھماتے ہوئے کہا۔۔۔۔"میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کرو"۔

گل نے بے صبری سے پیکٹ کھولا تو اس میں ایک خوبصورت ٹائی موجود تھی۔

اس نے گردن کے گرد لپیٹی ہوئی ٹائی کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔اور وہ شبنم کے الفاظ دہرانے لگا۔۔۔۔" زندگی اللہ کی امانت ہے"۔۔۔۔اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

o

چندا اور چاند

O

اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن میری ماں بہت پریشان تھی۔ میں صبح سے بھوکا تھا۔ ہمارے گھر کا سارا راشن ختم ہو گیا تھا۔ صبح کے وقت ماں نے مجھے باسی روٹی کا ٹکڑا بکری کے دودھ سے کھانے کو دیا تھا اور اب شام ہونے لگی تھی۔ میرے پیٹ میں بھوک کی وجہ سے درد ہونے لگا تھا۔ ماں نے مجھے پڑوسیوں کے ہاں آٹا ادھار مانگنے کو بھیجا لیکن وہاں سے بھی مایوس کن جواب ملا تھا۔ ماں سارا دن اپنی میٹھی اور لطیف باتوں سے مجھے بہلاتی رہی۔ جن سے تھوڑی دیر کیلئے میری بھوک کا احساس کچھ کم ہو جاتا لیکن بھلا باتوں سے بھی کسی کا پیٹ بھرا ہے؟ باتوں میں شہد جیسی مٹھاس ہو یا وہ کتنی بھی لطیف ہوں ان سے پیٹ نہیں بھرتا۔ پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کیلئے صرف روٹی چاہیے صرف روٹی! جو میری ماں کے پاس نہیں تھی۔ میری بھوک اچانک شدت اختیار کر گئی جیسے اچانک کسی نے ڈھول بجا دیا ہو۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ آخر میں نہ رہ سکا اور ماں کی قمیض سے لپٹ کر اپنے دل کا حال ماں سے کہہ دیا۔

"ماں مجھے بھوک لگی ہے"

ماں نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "میرے چندا...... میں صدقے واری جاؤں...... کیا کروں؟ دکان والے نے بھی ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے"۔

ماں اپنی پریشانی کو چھپا کر مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک اس نے

کچھ سوچتے ہوئے کہا آؤ چندا گھر میں ڈھونڈیں شاید کہیں پیسے رکھ کر بھول گئی ہوں۔ پھر تو میں نے اور ماں نے سارا گھر چھان مارا۔الماریاں، درازیں، صندوق ایک ایک کر کے اٹھا کر دیکھے لیکن کہیں سے بھی ایک کوڑی نہیں ملی۔آخر کار ماں تھک کر بیٹھ گئی اور میں بھی اس کے سامنے چارپائی پر لیٹ گیا۔

اچانک ماں کو ایک بات یاد آ گئی اور کہنے لگی "ارے......ایک جگہ تو ہم لوگ دیکھنا ہی بھول گئے۔غسل خانے والی کھڑکی میں ہم نے دیکھا ہی نہیں۔ماں نے جلدی سے کھڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو......"مل گئے"۔

میں نے تیزی سے ماں کے ہاتھ سے پیسے لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا لیکن ماں نے مجھے روک دیا اور کہا نہیں بھئی......ایسے نہیں! پہلے بتاؤ کتنے پیسے ہیں میری مٹھی میں؟؟ وہ پیسے ماں نے خود بھی نہیں دیکھے تھے۔

"ایک روپیہ" میں خوشی سے چیخ پڑا!

"غلط"

"آٹھ آنے"

"نہیں"

"اچھا دو آنے"

"نہیں"

جیسے جیسے ان پیسوں کو دیکھنے کیلئے میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی میری بولی کم ہوتی جارہی تھی "ایک آنہ" میں نے آخری بولی لگائی۔

ماں نے ایک دم اپنی مٹھی کھول دی ہم دونوں ماں بیٹے کے منہ سے چیخ نکل گئی ...... ''چار آنے''۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ہماری آواز کمرے میں ایک اداس گونج چھوڑ کر ڈوب گئی ۔ہم دونوں ماں بیٹے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔وہ چار آنے کھوٹے تھے ۔پرانے زنگ آلود لیکن میری آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''......ماں چل جائیں گے......اختر کی ماں اندھی ہے۔شام کو دکان پر وہی بیٹھتی ہے.....اسے دوں گا''میں نے کہا۔

''بری بات! تم بڑے گندے بچے ہو؟ ''......ماں نے غصے سے کہا ۔سکول کے بچے ہو کر یہ برا خیال تمھارے دل میں آیا کیسے؟ ماں یہ کہہ کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

وہ کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چکر لگا رہی تھی ۔جیسے ہمارا ماسٹر صاحب حساب کا سبق دیتے وقت کلاس میں چکر لگا تا ہے۔ماں کے چہرے پر ایک عجیب تاثر تھا جیسے وہ کوئی بڑا مسئلہ سلجھا رہی ہو۔اس کے قدم کبھی تیز ہو رہے تھے تو کبھی آہستہ ۔اچانک ماں کسی کی آواز سن کر رک گئی اور کہا......چندا جاؤ! اس آواز لگانے والے کو بلاؤ۔میں نے غور کیا......یہ آواز پرانے تانبے اور پیتل کے برتن لینے والے کی تھی ۔میں نے اس کو بلا کر گھر کے دروزے پر کھڑا کر دیا۔

''بھائی'' اس کٹورے کے کتنے پیسے دو گے؟ ماں نے دروازے کی اوٹ سے کٹورے والا ہاتھ باہر نکال کر کہا۔

اس نے جواب دیا آٹھ آنے۔

ماں نے ایک دم جواب دیا "...... بھائی کچھ تو خیال کرو؟ ......نیا کٹورا ہے"

اس نے کٹورا لوٹا کر اپنی ریڑھی آگے بڑھاتے ہوئے کہا "بی بی آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے۔تانبے، پیتل کو کون پوچھتا ہے؟"

ماں کچھ دیر تک چپ کھڑی رہی پھر میری طرف غور سے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا......دوڑو......چندا! اس برتن والے کو یہ کٹورا بیچ کر آٹھ آنے لے کر دکان سے آٹا لے آؤ...... تمھیں روٹی پکا دوں گی۔

دوسرے لمحے میری ہتھیلی پر آٹھ آنے کسی ستارے کی مانند چمک رہے تھے۔میں پوری طاقت سے مٹھی بھینچ کر دکان کی طرف دوڑا۔دکان پر پہنچا تو اختر دکان بند کر رہا تھا۔"ایک کلو آٹا دے دو" میں نے ہاتھ والے آٹھ آنے بڑھا کر اس سے کہا۔

"تمہارے ابو نے پیسے بھیجے ہیں کیا؟"

"ہاں"......میرے منہ سے نکل گیا۔

اختر نے ایک دم میرے ہاتھ سے آٹھ آنے لے کر کہا "......جاؤ! پہلے گھر سے میرے باقی پیسے لے آؤ۔پھر آ کر آٹا لے جانا"۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے ہونٹوں پر جیسے مہر لگ گئی تھی......میں مجبوراً خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

ماں نے میرا اُترا ہوا منہ اور خالی ہاتھ دیکھ کر گھبرا کر پوچھا......کیوں چندا......آٹا کہاں ہے؟ پیسے گر گئے کیا؟

"نہیں اختر نے چھین لیے" میں نے روہانسا ہو کر کہا۔

"ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے......اس کے پیسے بھی تو ابھی ہماری

طرف ہیں''

''ماں مجھے بھوک لگی ہے''......میں نے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بس اتنی سی بات ہے؟ آؤ اپنے چندا کو مٹھائی دوں۔۔۔''

''مٹھائی کہاں سے آئی؟''......میں نے خوشی سے پوچھا۔

ماں نے بتایا......پڑوس میں سلیم کا بھائی پیدا ہوا ہے......انھوں نے بانٹی ہے۔

پھر ماں نے ایک چھوٹی سے پلیٹ میں مٹھائی کے دو دانے رکھ کر اور گلاس میں بکری کا دودھ ڈال کر میرے آگے لا کر رکھا......لیکن دو دانے مٹھائی اور تھوڑا سا دودھ میری بھوک مٹانے کیلئے ناکافی تھا۔

شام کے دھندلے سائے گہرے ہوتے ہوئے رات کا روپ اختیار کرتے گئے۔کہیں کہیں سے کالی گھٹا کی تہوں سے ایک آدھ ستارہ چمک کر اپنا نور دکھا رہا تھا۔

ماں نے کہا''چندا......رات ہو رہی ہے......اب آؤ تمھیں نیند دیس کی کہانی سناؤں''۔

میں اور ماں چارپائی پر آ کر لیٹ گئے۔ماں اپنا بازو میرے سرہانے رکھ کر مجھے نیند دیس کی وہ کہانی سنانے لگی جس میں لوگ چھ مہینے سوتے اور چھ مہینے جاگتے تھے۔

میں نے ماں کی بات کو کاٹتے ہوئے پوچھا''............ماں وہ لوگ چھ مہینے کیسے سوتے تھے؟......کیا انھیں بھوک نہیں لگتی تھی؟''

ماں نے میری طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کر کہا "ہاں! نہیں لگتی تھی ...... تم چپ کر کے کہانی سنو"۔

"مجھے بھوک لگی ہے" ...... میں نے ضد کی۔

ماں کی آنکھیں اندھیرے آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ جیسے اس کی نظریں کچھ تلاش کر رہی ہوں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ...... "دیکھو چندا! آج آسمان پر چاند نہیں نکلا ہے؟ ہم غریب لوگوں کی روٹی کا حساب چاند کے جیسا ہے ...... کبھی چوتھا حصہ، کبھی آدھا، کبھی پورا ...... تو کبھی ہے ہی نہیں ......" میں نے اندھیرے آسمان کی طرف دیکھا اور ماں کے پہلو میں گہری نیند سو گیا۔

O

دہشتِ تنہائی

O

پروفیسر طارق کی آنکھ کھلی تو زبان پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ازخود جاری ہو گیا۔کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے اس نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔روشن دان پر نظر پڑتے ہی اسے باہر سپیدہ سحر کے اُجالے کا احساس سا ہوا۔نماز کا وقت ابھی باقی تھا۔اس نے جلدی جلدی بستر چھوڑ دیا۔ساتھ کے کمرے میں اس کی بیوی سوئی ہوئی تھی اس نے اسے بھی آواز دی اور غسل خانے میں چلا گیا۔وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر اللہ رب العزت کے حضور سر بسجود ہو گیا۔اتنی دیر میں اس کی بیوی، بیٹا اور بیٹی بھی جاگ گئے۔سب نے جلدی جلدی وضو کئے اور نماز ادا کرنے لگے۔ پروفیسر طارق ابھی نماز ختم کر کے برآمدے میں ہی کھڑا تھا کہ اسے کچھ یاد آ گیا اور وہ کاغذات والی الماری کھول کر اس میں سے ان کاغذات کو تلاش کرنے لگا جو بہت پہلے اس نے ایک فائل میں لگا کر اس الماری میں رکھے تھے۔وہ کاغذات تلاش کرتا رہا اور اس کی بیگم باورچی خانے میں جا گھسی۔ناشتہ تیار کرنے میں اس کی بیٹی نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا اور بیٹا دوبارہ جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

پروفیسر طارق کافی دیر کاغذات کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن اسے مطلوبہ فائل ابھی تک مل نہیں پا رہی تھی۔اس یقین تھا کہ اس نے وہ کاغذات اسی الماری میں رکھے تھے لیکن زیادہ عرصہ گزر جانے کی وجہ سے اسے فائل کی رنگت اور

شیلف کا نمبر یاد نہیں تھا اس لئے اس نے ایک طرف سے فائلوں کو اٹھا کر کھولنا شروع کر دیا۔اس کے ہاتھ برق رفتاری سے کام کر رہے تھے۔ابھی وہ دوسرے شیلف کی تلاشی لے رہا تھا کہ اس کی بیگم نے آواز دی۔

''آجایئے...... ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے اور بچوں کو سکول سے بھی دیر ہو رہی ہے''

اس کی بیگم کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا تلاش کر رہے ہیں لیکن اس سے بھی ضروری کام بچوں کیساتھ ناشتہ کرنا اور انہیں بر وقت سکول بھیجنا تھا۔اور پروفیسر صاحب بھی اگر ناشتے سے لیٹ ہو جاتے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے۔ اس لئے اس نے دوبارہ آواز دینے کے بجائے خود آ کر انہیں ساتھ لے جانا مناسب سمجھا۔

''کیوں...... فائل نہیں مل پا رہی یا آپ کسی اور چیز میں کھوئے ہوئے ہیں......اب بس کریں ناشتہ کر لیں پھر دونوں مل کر تلاش کرتے ہیں......''

''ہوں......اچھا اچھا چلو''پروفیسر صاحب نے بیگم کو اشارہ کیا اور اس کی پیروی میں ناشتے کی میز پر آ کر بیٹھ گئے۔

گرم گرم ناشتے کی مہک اور بچوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق مزید بڑھ گئی......سوری بچو! دراصل میں ایک ضروری فائل تلاش کر رہا تھا اس لئے تھوڑی دیر ہو گئی......چلو شاباش شروع کرو......دانش! (انہوں نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے بات شروع کی)......سناؤ کب تک ڈیٹ شیٹ اناؤنس ہو رہی ہے تمہارے امتحانات کی؟

''ابو! فی الحال یکی بات تو معلوم نہیں لیکن اگلے پانچ چھ روز میں متوقع ہے''۔دانش نے جواب دیا۔

''اس بار اگر میٹرک کی طرح نمبر کم لئے تو سمجھو کہ تمہارا مستقبل ختم......
اگر میٹرک میں سات سو نمبر تھے اور ایف ایس سی میں تو 90 فیصد سے اوپر ہونے چاہئیں......سخت محنت کرو تا کہ تمہیں شرمندگی نہ ہو''......پروفیسر صاحب نے بیٹے کی ہمت بڑھائی۔

''یہ کیا نمبر لے گا......نمبر تو اس بار میں لوں گی ابو!......دیکھنا اس دفعہ میں بورڈ میں ٹاپ کروں گی''......انیلہ نے دانش کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

بچوں نے اسی نوک جھونک میں ناشتہ کیا اور جیسے ہی ناشتے سے فارغ ہوئے کالج وین نے ہارن بجا دیا۔میاں بیوی نے حسبِ معمول باہر لان تک آ کر دونوں بچوں کو خدا حافظ کہا اور مسکراتے ہوئے واپس آ گئے۔

تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی......پروفیسر صاحب نے سکوت توڑتے ہوئے بیگم سے کہا:

تم برتن وغیرہ سمیٹو میں فائل تلاش کرتا ہوں......پھر دونوں ایک ساتھ چلیں گے۔

ٹھیک ہے مگر مجھے تو انیلہ کے کالج بھی جانا ہے......بتا رہی تھی کہ ہماری پرنسپل نے بلایا ہے......بیگم باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

اچھا......تو پھر مجھے اکیلے ہی جانا ہو گا......یہ کہتے ہوئے پروفیسر طارق دوبارہ اپنے کمرے میں جا گھسا۔

اچھے وقتوں میں پروفیسر صاحب نے مشترکہ بیمہ پالیسی خریدی تھی۔اس کی آخری قسط بھی گزشتہ ماہ ادا ہو چکی تھی۔انہوں نے بیگم کے مشورے سے پروگرام بنایا تھا کہ ان پیسوں سے بیٹے اور بیٹی کے لئے کچھ زیور خرید لیا جائے۔کیونکہ ان کے بھائی صاحب کئی بار رانیلہ اور دانش کی شادی کرنے کا اشارہ دے چکے تھے۔پروفیسر طارق نے اپنے بڑے بھائی صاحب کے ہاں ان دونوں کی منگنی کر رکھی تھی اور انہیں بچوں کے ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد شادی کرنے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔

کچھ دیر کے فائل تلاش کرنے کے بعد پروفیسر طارق کو خیال آے کہ وہ فائل تو انہوں نے دوسری الماری کے سیف میں رکھی تھی۔جیسے ہی انہیں فائل یاد آئی ان کا موڈ خوشگوار ہو گیا لیکن ایک سوچ کی لہر اچانک ذہن میں جھما کا مار گئی......اب واقعی میں بوڑھا ہو رہا ہوں......جھٹ سے انہوں نے دوسری الماری کا سیف کھولا اور فائل نکال لی۔انہوں نے وہیں سے بیگم کو آواز دے کر بتایا کہ فائل مل گئی ہے اب جلدی سے تیار ہو جائیں۔اکٹھے نکلیں گے۔

بیمہ کمپنی والوں ان کی تفصیلی بات چیت ہو چکی تھی اور انہوں نے آج دس بجے کا وقت دیا تھا۔ان کا خیال تھا کہ میں نو بجے گھر سے نکلوں گا اور ٹھیک دس بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔حسبِ وعدہ ایک آدھ گھنٹے میں چیک مل جائے گا۔وہاں سے بینک قریب ہی ہے جہاں اسے جمع کرانا ہوگا۔ایک آدھ گھنٹہ مزید لگے گا اور میں تقریباً بارہ بجے گھر لوٹ آؤں گا۔

تھوڑی دیر آرام کرسی پر بیٹھنے کے بعد پروفیسر طارق وہاں سے اٹھے اور بیگم کے پاس پہنچ گئے۔جو کالج جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔پروفیسر طارق سنگھار میز

کے سامنے بیٹھی بیوی کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

بس......دو منٹ! بیگم نے آئینے سے ان کے سراپے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

اللہ کرے یہ دو منٹ کبھی ختم نہ ہوں...... پروفیسر طارق نے شرارت بھرے لہجے میں کہا اور بیگم مسکرا دی۔

اگلے چند لمحوں میں دونوں گھر سے باہر نکلے اور مین روڈ پر آ کر رک گئے۔

"ایک ہی ٹیکسی لیتے ہیں میں راستے میں اتر جاؤں گا اور آپ کالج چلے جانا"......پروفیسر طارق نے بیگم سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے"......بیگم نے کہا۔

صبح صبح سڑک پر خاصا رش تھا اور خالی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ایک خالی ٹیکسی ان کے قریب آ کر رکی۔ پروفیسر طارق نے ڈرائیور سے کالج جانے کا کہا اور دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

آپ کب تک فارغ ہو جائیں گے......بیگم نے پوچھا۔

میرے خیال میں بارہ تو بج ہی جائیں گے...... پروفیسر طارق نے جواب دیا۔

خیر اتنے تک میں بھی لوٹ آؤں گی......میرے خیال واپسی پر اکٹھے ہی آ جائیں۔

نہیں تم میرا انتظار نہ کرنا......ہو سکتا ہے تم جلد فارغ ہو جاؤ اور مجھے دیر ہو جائے۔ میں کسی دوسری ٹیکسی پر آ جاؤں گا۔

دوسرا کام پھر کل ہی ہو سکے گا...... بیگم نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

ہاں! انشاءاللہ کل چلیں گے...... بس دعا کرو کل یہ پیسے بھی مل جائیں۔

اللہ خیر کرے گا...... لیکن ایک بات یاد رکھیں میں نے زیورات وہی لینے ہیں جو "مارگلہ جیولرز" کے پاس دیکھے تھے۔

ٹھیک ہے...... مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی یہ شعبہ تمہارا ہی ہے۔

ٹیکسی جیسے ہی بیمہ کمپنی کے دفتر کے سامنے پہنچی تو پروفیسر صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا۔

ٹیکسی جیسے ہی رکی پروفیسر صاحب نے بیگم کو خدا حافظ کہا اور گاڑی سے اتر گئے۔ تھوڑی دیر گاڑی کو مین روڈ پر جاتا دیکھتے رہے اور پھر بیمہ کمپنی کے دفتر میں چلے گئے۔

دفتر میں جیسے ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ علیک سلیک اور حال احوال کے بعد انہوں نے کاغذات نکال کر میز پر پھیلا دیئے۔ بیمہ ایجنٹ نے کاغذات پر ان کے دستخط لئے اور پندرہ بیس منٹ میں چار لاکھ بیاسی ہزار کا چیک انہیں تھماتے ہوئے مبارکباد بھی دی۔ پروفیسر صاحب نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چیک کا سرسری جائزہ لیا اور اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ وہاں سے نکل کر اس روڈ پر تھوڑی دور بینک میں پہنچ گئے۔ چالان وغیرہ بھر کر چیک جمع کرایا اور تھوڑی دیر میں بینک سے بھی فارغ ہو گئے۔

انہوں نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو ٹھیک گیارہ بج چکے تھے۔ بینک سے باہر نکلتے ہوئے انہیں ہلکا سا چکر آیا لیکن وہ سنبھل گئے۔ بس ایک جھٹکا سا تھا...... پروفیسر

طارق کے خیال میں چونکہ بینک میں اے سی چل رہے تھے اور یکدم گرم ماحول میں نکلنے سے ایسا ہوا ہوگا۔

تھوڑی سے تک وہ نارمل ہو چکے تھے۔انہوں نے سوچا کہ بیگم بارہ بجے تک ہی آئے گی۔لہذا کچھ دیر ونڈو شاپنگ کا مزہ لیا جائے اور وہ الیکٹرونکس کی ایک دکان میں جا گھسے۔جہاں ریفریجریٹرز اور ٹی وی خریدنے والے گاہکوں کی بھیڑ سی لگی تھی۔ دکان کے اندر ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھنے لگے۔سکرین پر اچانک بریکنگ نیوز کی سکرین آئی......سرسید کالج میں دھماکہ......متعدد افراد کے ہلاک ہونے کا غدشہ......

یکدم دکان میں سناٹا چھا گیا......ہر ایک ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گیا...... ایک اور سکرین ابھری......اب سے چند لمحے پہلے سرسید کالج کے اندر ایک زوردار خودکش دھماکہ ہوا......اور کالج کے اندر زخمی اور ہلاک ہونے والوں کو اٹھانے والے لوگوں، پولیس گاڑیوں ،ایمبولینس اور میڈیا کے لوگوں کو دکھایا جانے لگا......

پروفیسر صاحب فوراً دکان سے باہر نکل آئے۔ان کا بیٹا اور بیٹی بھی اسی کالج کے طالب علم تھے۔انہیں ان کی فکر پڑ گئی۔پروفیسر صاحب نے فون پر بیگم سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔فون ملاتے ملاتے انہوں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور ڈرائیور کو جلد از جلد سرسید کالج پہنچنے کا کہا۔کافی دیر کوشش کے بعد ان کا رابطہ بیگم سے ہوا......بیگم نے انہیں بتایا کہ وہ ابھی تک کالج میں ہی ہے لیکن یہاں اتنا شور ہے کہ کچھ سنائی نہیں دیتا......انہوں نے فون منقطع کر دیا۔ڈرائیور کو سپیڈ بڑھانے اور جلد وہاں پہنچنے کی تاکید کرتے کرتے ان کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔

جیسے ہی ٹیکسی کالج کے قریب پہنچی وہاں ٹریفک جام تھا۔کالج کی طرف جانے والی سڑک پر پولیس کی گاڑیوں اورایمبولینس کو جانے کی اجازت تھی۔لوگوں کا ایک جمِ غفیر جمع ہو چکا تھا اور پولیس والے کسی کو آگے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔کئی بار انہوں نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھا جائے لیکن سب کچھ بے سود......

اچانک کالج کی جانب سے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور سب لوگ سہم کرزمیں بوس ہو گئے۔آواز اور گرج کے بعد کالج کے احاطے سے گردوغبار اور دھوئیں کے بادل اُٹھتے ہوئے محسوس ہوئے.....کالج میں ایک اور دھماکہ ہو گیا تھا۔شوروغل اور چیخ وپکار میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔پروفیسر طارق نے اپنے آپ کو بے بسی کی انتہائی سطح پر پایا۔کالج کی طرف سے بھاگ کر آنے والے طالب علموں اور دیگر لوگوں کو روک روک کر پوچھنے لگا.....بیٹا سیکنڈ ائر کی کلاس میں میرا بیٹا دانش اور بیٹی انیلہ بھی تھے؟.....بیٹا سیکنڈ ائر......

ہر ایک جواب دیتا کہ کچھ پتہ نہیں کون کس حال میں ہے.....وہاں تو بس زخمی اورانسانی اعضا کے چیتھڑے ہیں۔

اسے اچانک خیال آیا کہ ہسپتال جایا جائے جہاں زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کی فہرستیں لگی ہوتی ہیں.....وہ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا جہاں ایمرجنسی کے باہر کالج سے بھی بڑا اژدھام تھا۔ہر ایک اپنے پیاروں کی تلاش میں سرگرداں.....اسے اپنی بیگم کا خیال آیا.....نجانے وہ کس حال میں بچوں کو تلاش کر رہی ہوگی.....اس نے بیگم سے کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود......

کچھ دیر بعد ہسپتال کے ایم ایس نے باہر آ کر میڈیا والوں کو بتایا کہ زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کی فہرستیں تیار ہو رہی ہیں ......تھوڑی دیر تک اسقبالیے پر چسپاں کی جائیں گی......پروفیسر بار بار دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا......

اُسے اچانک خیال آیا...... مجھے گھر بھی پہنچنا چاہیے کہیں بیگم اور بچے مجھے تلاش نہ کر رہے ہوں؟اس نے ٹیکسی لی اور گھر پہنچ گیا......وہاں ابھی تالے پڑے تھے۔نہ بیگم نہ بچے......پڑوس میں صدیقی صاحب کا گھر تھا اس نے ان کی ڈور بیل بجائی ......صدیقی صاحب باہر نکلے تو اس نے فوراً اپنے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا......

پروفیسر صاحب!یہ بات تو ابھی تمہاری بھابھی بھی کر رہی تھیں کہ نجانے آج پروفیسر صاحب کی فیملی کہاں ہے؟......کیوں خیریت؟ آپ آج کہاں تھے؟

پروفیسر طارق نے تمام رام کہانی انہیں سنائی......جسے سن کر صدیقی صاحب بھی پریشان ہو گئے۔وہ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ اندر سے صدیقی صاحب کا بچہ نکلا......بجائے سلام کرنے کے وہ کچھ کہتا کہتا خاموش ہو گیا......صدیقی صاحب نے بچے کو سوالیہ نظر سے دیکھا تو اس نے انہیں اشارہ سے اندر بلایا......صدیقی صاحب معذرت کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔

O

مُعمّہ

O

پوری کلاس کا خیال یہ تھا کہ نسرین انتہائی مغرور اور گھمنڈی لڑکی ہے اسی وجہ سے وہ کسی سے بھی بات کرنا گوارا نہیں کرتی۔ لیکن میرا نقطہ نظر ان سب سے الگ تھا۔ میں اس بات کو ماننے پر تیار ہی نہ تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نہ تو وہ انتہائی خوبصورت تھی اور نہ ہی ذہین...... دوسری جانب اس کی چال ڈھال اور کپڑوں سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی امیر کبیر گھرانے کی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ محض کم گوئی اور تنہائی پسندی کو مغروری اور گھمنڈ پر محمول کرنا اس کے ساتھ ناانصافی تھی۔ میرا اس بات پر کافی دفعہ کلاس کے لڑکے لڑکیوں سے جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔ بعض اوقات تو مجھے اپنے اس رویے پر حیرت بھی ہوتی۔ نہ میری اس سے کبھی اس معاملے پر بات ہوئی اور نہ ہی میں اس سے محبت کرنے کا دعویدار تھا پھر بھی نجانے کیوں میں اس کی طرف داری پر تلا ہوا تھا۔ ایک دوبار تو میں نے تنہائی میں بیٹھ کر اس بات پر بھی غور کیا کہ کہیں مجھے اس سے محبت تو نہیں ہوگئی۔ لیکن مجھے اپنے دِل سے اس کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ کافی دفعہ میں نے نسرین سے اس کی کم گوئی پر بات کرنے کی ٹھانی لیکن مجھے کوئی معقول بہانہ نہیں مل پا رہا تھا کہ ایک دن اچانک اس نے مجھے روک کر کہا...... میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں؟

میں نے چونک کرانتہائی حیرت سے کہا.......جی فرمایئے؟

"فرمانے والی بات نہیں...... براہِ کرم آپ میرے ساتھ ہمدردی کرنا اور دوسروں سے الجھنا چھوڑدیں"......اس نے بےزاری سے کہا۔

میں بھلاتم سے ہمدردی کرنے والا کون ہوں؟باقی رہی دوسروں کی بات تو جیسے انہیں آپ کے بارے میں رائے دینے کا حق حاصل ہے اسی طرح جواب دینے کا حق مجھے بھی ہے۔کیاتم مجھ سے وہ حق چھیننا چاہتی ہو؟تم دوسروں کوتو اپنے بارے میں رائے دینے سے منع نہیں کرتیں اور مجھے دفاع کرنے سے منع کررہی ہو؟......خیر مجھے آج بتاہی دو کہ تم نے خودکوایک معمہ کیوں بنارکھا ہے؟

وہ چپ رہی۔

محترمہ میرے سوال کا جواب دو......تمہاری خاموشی سے میرا دم گھٹ رہا ہے......میں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

اور پھراس کے منہ سے موتی جھڑنے لگے۔اس کی آواز کسی مدھر سنگیت کی طرح آنے لگی۔"یہ بات مجھے آج معلوم ہوئی ہے کہ کسی کے بات نہ کرنے سے بھی کسی کادم گھٹ سکتا ہے؟؟؟"

میرا حیرت سے کھلا منہ بس کھلا رہ گیا......میں زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......تم نے چپ کاروزہ رکھ کر پوری کلاس کوجس کرب میں مبتلا کررکھا ہے اس کا بھی تمہیں احساس ہونا چاہیئے"۔

"بڑی عجیب بات ہے؟میرے خاموش رہنے سے دوسروں کوتکلیف ہوتی ہے تو مجھے اس بات کا بےحد افسوس ہے"......اس کا جملہ اورتاثرات دیکھ کرمیری ہنسی

نکل گئی۔

تمہیں معلوم ہے پوری کلاس تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟

دوسروں کا تو پتا نہیں لیکن آپ کی رائے کے بارے میں میں خوب جانتی ہوں۔

میری بات چھوڑیں......تمام لوگ تمہیں انتہائی مغرور سمجھتے ہیں۔

کیا آپ بھی مجھے مغرور سمجھتے ہیں؟ اس کے اچانک سوال پر میں بوکھلا سا گیا۔

اگر آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں تو میرے بارے میں اتنی ہمدردی دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟

نہیں میں تمہیں ویسا نہیں سمجھتا لیکن کوئی بات ضرور ہے جس کی وجہ سے تم خاموش رہتی ہو......وہ خاموش رہی۔

تمہارا چپ کا روزہ پھر شروع ہو گیا ہے......اور تمام کلاس ہمیں معنی خیز نظروں سے گھور رہی ہے اس لئے خدا حافظ۔

اس کے بات چیت کے کافی دنوں بعد تک میں اپنے اندر جیسے خود کلامی میں مصروف رہا......کبھی وہ مجھے بڑی پر کشش لگتی اور کبھی انتہائی مجبور......کبھی میں اسے پریشان حال اور اداس طبیعت لڑکی سمجھتا تو کبھی ضدی اور مغرور......لیکن مجھے کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ پھر اچانک اس نے یونیورسٹی آنا بند کر دیا۔ چار پانچ دن میں کافی اداس اور پریشان رہا۔ میں اپنے آپ میں تنہا پن محسوس کرتا حالانکہ میری دوبارہ اس سے کبھی بات بھی نہ ہو سکی تھی۔ چار پانچ دنوں کی غیر حاضری کے بعد جیسے

ہی وہ مجھے کلاس روم میں بیٹھی نظر آئی میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے دور سے ہی دیکھ کر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اپنی آمد کا احساس دلایا۔ میں اس کی غیر حاضری کا سبب جاننا چاہتا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ میری بات کو ٹال جائے گی۔

کلاس کے بعد جیسے ہی ہم کمرے سے نکل رہے تھے میں نے اپنی الجھن سوال میں لپیٹ کر اس کے کاندھوں پر ڈال دی۔

میرے انکل جب شہر میں آتے ہیں تو میں پڑھنے نہیں آتی۔

کیوں؟

بس وہ نہیں چاہتے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔

تمہارے والد کے ہوتے ہوئے تمہارے انکل مزید تعلیم سے کیوں روکتے ہیں؟

وہ خاموش ہوگئی اور اداسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی......ان کے بیٹے سے میری منگنی ہوگئی ہے۔

میری بولتی بند ہوگئی......

طویل خاموشی کے بعد میں نے پوچھا کہ تمہارا منگیتر پڑھا لکھا ہے؟

صرف اٹھ جماعتیں۔اس نے مختصر جواب دیا۔

تمہارے والد نے اتنا بے جوڑ رشتہ منظور کیسے کرلیا۔

ہمارے رشتے ناطے برادری سے باہر نہیں ہوتے اور میری منگنی تو میری پیدائش کے ساتھ ہی طے ہوگئی تھی۔

اس مقام پہ مزید بات چیت کی گنجائش ختم ہوگئی......اور ہم جدا ہوگئے۔

ہمارے امتحانات کے دِن چونکہ قریب آ رہے تھے اس لئے ہم سب لوگ اپنے اپنے انداز میں تیاری میں جت گئے ۔ اچانک نسرین کلاس سے غیر حاضر رہنے لگی ۔ کلاس میں چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن کسی کا اندازہ درست سمت نہیں تھا ۔ میں کلاس روم میں اس کی خالی سیٹ کو دیکھتا تو دِل ڈوبنے لگتا ۔ اس کی صورت میری نگاہوں میں سما جاتی جیسے وہ کسی درد کے پاتال سے ابھرتی اور غائب ہو جاتی ہو اور میرا دم گھٹنے لگتا ۔

ایک دن اچانک مجھے ایک مختصر سا رقعہ ملا جس میں اس نے مجھ سے آخری بار ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا ۔ آخری دفعہ؟ مجھ پہ شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ جب ہم طے شدہ مقام پر ملے تو نجانے کتنی دیر تک ہم میں سے ایک بھی نہیں بولا ۔ آخر ہمارا رشتہ ہی کیا تھا کہ آخری ملاقات کر رہے تھے ۔ اس کی اداسی کو دیکھ کر مجھے اپنے دل میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے ۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ دل میں گھٹن اور گھبراہٹ بڑھنے لگی تو میں نے ایک سوال اُچھالا ۔

تم نے یونیورسٹی آنا کیوں چھوڑ دیا؟؟

میری شادی کا دِن مقرر ہو چکا ہے...... نسرین کے آنسو موتی بن کر اس کے گالوں پر لہرائے ۔

ہمارے درمیان دوبارہ طویل خاموشی کی دیوار حائل ہو گئی ۔

میرے بارے میں اب بھی کلاس کے لڑکے لڑکیاں باتیں کرتے ہیں یا نہیں؟؟ اس نے مردہ سی آواز میں کہا ۔

تم اب بھی ان کے لئے معمہ ہو...... میں نے جواب دیا ۔

تم بھی دوسروں کی طرح مجھے معمہ سمجھتے تو اچھا ہوتا ۔ خواہ مخواہ مجھے سمجھ کر تم

نے خود کو روگ لگا لیا۔

میں نے شدتِ غم سے آنکھیں بند کر لیں ------ کافی دیر بعد میں نے نسرین کی جانب دیکھنا چاہا تو اس کی جگہ ایسے خالی پڑی تھی جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

O

دُکھ کی دیمک

O

وہ رات بھر روتا رہا..... ساری رات اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے زیرو بلب کی مدھم روشنی میں وہ اُس تصویر کو تکتا تھا جس میں اُس کا پورا کنبہ بیٹھا تھا......اس کے چاروں بیٹے اُس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ ایک کو، جو ان سب میں سے چھوٹا تھا، اُس نے اپنی گود میں اُٹھا رکھا تھا...... جس بیٹے کو وہ اٹھائے کھڑا تھا یہ وہی تھا جو آج اُس سے الگ ہوا تھا اور اِس بات پر اُسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ جب بھی بیٹے ماں باپ سے الگ ہوتے ہیں انھیں یقین ہی نہیں آتا۔

دراصل اُس نے کبھی اس پہلو پر سوچا بھی نہ تھا کہ جن بچوں کو اُس نے پال پوس کر، پڑھا لکھا کر جوان کیا ہے..... کسی قابل بنایا ہے وہ اتنی معمولی معمولی باتوں پر اس سے الگ ہو جائیں گے۔

آج بھی جب اُس سے اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا الگ ہوا تھا تو وہ اس بات کو ایک انجانا خواب سمجھ رہا تھا۔ اسے اس بات کے حقیقی ہونے کا یقین ہی نہ ہو رہا تھا کہ جس بچے کی اس نے آج سے صرف دو سال پہلے بڑے ارمانوں اور بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی وہ اس سے اس طرح اور اتنی جلدی اور اتنی معمولی بات پر خفا ہو کر الگ ہو جائے گا۔ وہ اپنی حیرت زدہ صورت کو آئینے کے سامنے جا کر دیکھنے لگا...... اس کے چہرے پر بوڑھی جھریوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا اور ان جھریوں کے درمیان ابھرتی ہوئی دکھ کی گہری لکیریں کچھ اور واضح ہو چکی تھیں...... اسے اپنا اداس اور غمگین

چہرہ دیکھ کراب کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا...... یہ بات سچ تھی کہ اس کا بیٹا اس سے الگ ہو رہا ہے۔ یہ کوئی خواب نہیں بلکہ اٹل حقیقت تھی...... سچ مچ اس کا چھوٹا بیٹا اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔

زیرو کے بلب کی مدھم اور کمزور روشنی میں تصویر کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں اس کا بے رحم ماضی گھوم گیا۔اس نے ایک سکول ماسٹر کی معمولی نوکری اور قلیل تنخواہ پر اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر اپنے بچوں کو اس قابل بنایا...... اپنے گھر کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے لوگوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا رہا...... اپنے بچوں کے روشن مستقبل اور خوبصورت سپنوں کی خاطر اس نے اپنی جوانی اسی طرح اپنی خواہشوں اور بیوی کے ارمانوں کا گلا گھونٹتے گھونٹتے گزار دی اور ہر حال میں اپنے بچوں کو اچھے کپڑے، بہترین خوراک اور اعلیٰ تعلیم دی۔

اور آج...... آج جب وہ ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ چکا تھا تو اس کے چاروں بیٹے اپنے بیوی بچوں کو لے کر اس سے باری باری الگ ہو گئے تھے۔جن کے سہارے اس نے اپنا بڑھاپا گزارنے کے سہانے سپنے دیکھ رکھے تھے وہ اسے تپتی دوپہر میں ننگے پاؤں چھوڑ کر خود وقت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے جا بیٹھے تھے۔یہ سوچتے سوچتے اس کے سینے سے ایک گرم بگولے جیسی آہ نکل گئی۔اسے رہ رہ کر وہ لمحہ یاد آ رہا تھا جب وہ اپنے گیارہ ماہ کے پوتے کو گود میں لے کر پیار کر رہا تھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے اس کی بہو نے بچے کو اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا...... اسے اس لمحے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو۔اس کا بیٹا گھر کی دہلیز عبور کر کے چپ چاپ ٹیکسی میں اپنی بیگم کے پہلو میں جا بیٹھا اور ٹیکسی کسی انجانی منزل کی

جانب روانہ ہوگئی ۔وہ یہ سب کچھ دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا اور دکھ کو نا قابلِ برداشت جان کر کھڑکی سے ہٹ آیا۔اس کی بہو اور بیٹے نے جب گھر سے باہر قدم رکھے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک ایسا مالی ہے جس کے سامنے اس کا باغیچہ ویران ہو رہا ہو اور وہ پھولوں کی بکھری ہوئی پتیوں کو حسرت سے دیکھ رہا ہو۔

اُس لمحے اُسے اپنی بیوی یاد آئی جو دوسرے کمرے میں فرش پر بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی ۔۔۔۔۔وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔۔۔۔۔اس کی بیوی نے بھی دکھ اور غمزدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ بول سکی ۔۔۔۔۔گونگوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔۔۔۔۔اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں آ کر بستر لیٹ گیا اور دیوار پر لگی تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔۔۔۔۔تصویر کو دیکھتے دیکھتے نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی بانہوں میں چلا گیا۔

صبح اُٹھا تو اس کا سکول جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔لیکن حسب معمول اس کی بیگم نے پانی گرم کیا اور تولیہ غسل خانے میں لٹکا کر اُسے اطلاع دی۔۔۔۔۔وہ بے دلی سے اٹھا غسل کیا اور جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔۔۔۔۔نماز کے بعد اس نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ہاتھوں کے کاسے میں کسی چیز کی کمی ہے۔۔۔۔۔اس کے ذہن میں زندگی میں پہلی دفعہ ایک سوال ابھرا۔۔۔۔۔کیا خدا موجود ہے؟یا پھر ہم ایسے ہی دعاؤں کے کاسے پھیلائے رہتے ہیں؟؟۔۔۔۔۔وہ بہت دیر تک اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا لیکن یہ گتھی اس سے سلجھ نہیں رہی تھی۔۔۔۔۔وہ گھبرا اٹھا اور استغفر اللہ پڑھتے ہوئے سجدے میں جا گرا۔کافی دیر تک خدا کے حضور

معافی کے لئے گڑگڑاتا رہا...... ندامت کے اشکوں کی رو جب زرا تھمی تو اس نے لاحول ولا قوۃ...... پڑھ کر اُس شیطانی وسوسے کو دماغ کی سلیٹ سے صاف کر دیا......ناشتہ کرنے کے بعد اس نے اپنی پرانی سائیکل اُٹھائی اور سکول کی جانب روانہ ہو گیا۔وہ سوچوں میں گم سکول کی جانب محوِ سفر رہا۔اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی......اب میں یہ سکول ماسٹری کس کے لئے کروں؟......کس کی خاطر؟......کماؤں گا تو کس کے لئے؟؟......لیکن کافی دیر سوچنے کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور اپنے سوالوں کا اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہ بن پڑا۔انہی سوچوں میں وہ سکول پہنچ گیا......وہاں پہنچ کر بھی اسے ایسے محسوس ہوا کہ وہ آج پڑھا نہ پائے گا......اُسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ کل اس نے سبق کہاں پہ چھوڑا تھا......

اسمبلی کے دوران بھی وہ خاموش بیٹھا رہا...... دوسروں کے ساتھ مل کر قومی ترانہ پڑھنے کے بجائے وہ قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کی تصاویر کو گھورتا رہا۔اسمبلی کے بعد وہ خاموشی سے اپنی کلاس میں چلا گیا۔بچوں کی حاضری لینے کے بعد اس نے مانیٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا" ......آصف!کل کہاں تک پہنچے تھے؟"

"سر!کل ہم نے کوتم بدھ والے سبق کو درمیان میں چھوڑا تھا" مانیٹر نے جواب دیا۔

"ہوں......" اس نے صرف اتنا کہا اور بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا" اپنی اپنی کتابیں کھولو؟"

سب بچے مہاتما بدھ والے سبق کو نکال کر اپنے استاد کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے جو آج بہت اداس نظر آ رہا تھا۔

اس نے پڑھنا شروع کیا" ...... گوتم بدھ نے اپنی جوانی میں زندگی کے کچھ ایسے مناظر دیکھے کہ اُسے محسوس ہوا جیسے یہ دنیا محض جھوٹ، فریب اور صرف ایک خوبصورت خواب ہے...... اس سنسار اور دنیا میں رہ کر سچے سکھ کی تلاش و جستجو کرنا ہی ایک سچائی ہے...... اس طرح وہ دنیا کے غموں، دکھوں اور آسائشوں پر انتہائی غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا کے ان تمام مسائل کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ ہے دنیا کے تمام لوازمات سے مکمل کنارہ کشی۔ ایک رات وہ اپنے عزیز واقارب، محل، غلام اور سب کچھ چھوڑ کر نروان کی تلاش میں نکل پڑا......" یہاں تک پڑھنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اپنے استاد کو خاموش دیکھ کر ایک لڑکے نے سوال کیا" سر! دنیا سے منہ موڑ کر...... اپنے بیوی بچوں اور عزیز اقارب کو چھوڑ کر چپ چاپ گھر سے نکل جانا کیا غلط نہیں؟"

بچے کا سوال سن کر ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے بجلی کے کسی ننگے تار کو چھو لیا ہو...... لیکن اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس نے کہا" دنیا یا مال و دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتا...... انسان کی زندگی میں کبھی ایسا موڑ بھی آجاتا ہے کہ وہ اس دُنیا سے تنگ آجاتا ہے...... تب اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا...... اسے یہ سب جھوٹ اور دھوکہ لگتا ہے اور وہ اس دُنیا کو، اس کی رنگا رنگی اور ہنگاموں کو محض ایک فریب سمجھنے لگتا ہے"۔

لڑکے کو یہ دلیل کچھ پسند نہ آئی...... اس نے دوسرے سوال کا گولہ فائر کیا" اچھا سر! یہ بتائیں کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی کسی انسان کے دِل میں اس دُنیا سے کنارہ کشی کی اس خواہش پیدا ہو سکتی ہے؟"

''ہاں بیٹا!......ایسا ممکن ہے...... یہ سچ ہے کہ سب لوگ کوتم نہیں ہو سکتے، تاہم دُنیا اوراس کے مال واسباب کی محبت سے نفرت ضرور ہوسکتی ہے......دُنیا کی رنگینیوں اور ہنگاموں سے انسان بیزار ہو سکتا ہے......اس کا محرک کچھ بھی ہو......لیکن ایسا ممکن ہے''

''وہ کیسے؟'' بچے نے وضاحت چاہی۔

اس سوال پر وہ کچھ دیر کے لئے بالکل خاموش ہوگیا......لیکن اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگا'' کیسے؟......وہ ایسے کہ جیسے کسی کے چار بیٹے ہوں......جن سے اس کی بہت سی اُمیدیں اور خوبصورت سپنوں کی حسین تعبیریں وابستہ ہوں......لیکن بڑے ہوکر ایک بھی بیٹا اس کے ساتھ رہنا پسند نہ کرے......اور سب ایک دوسرے سے جدا جدا ہو جائیں......جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹنے کے بعد موتی بکھر جاتے ہیں......تو پھر اس شخص کے احساسات کے بارے میں تم خود سوچ کر بتاؤ کہ دُنیا کی محبت اس کے دِل میں کتنی ہوسکتی ہے اور دُنیا میں اس کے لئے رکھا بھی کیا ہے؟؟......دُنیا اوراس کی ہماہمی اس کے سامنے اپنی حقیقت کھو دیتی ہے''۔

وہ شاید مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن درمیان سے ایک اور بچے نے سوال اٹھایا''سر......!ہر ایک کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوسکتا......اور یہ ضروری تو نہیں کہ سب کے بچے ایک جیسے ہوں......کوئی بچہ اپنے والدین سے کیسے الگ رہ سکتا ہے؟......کیسے سر؟''

اس سوال پر اس کا جی بھر آیا......اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس نے کہا''......ایسا......ایسا ہوسکتا ہے......تم مجھے ہی دیکھو......میرے بھی چار بیٹے

ہیں......تین تو پہلے ہی ایک ایک ہو کر مجھ سے جدا ہو چکے تھے......کل چوتھا بھی مجھ سے الگ ہو گیا"۔

"اچھا......!" بچے حیرت سے بول پڑا۔

"کیوں سر!......سب آپ سے الگ کیوں ہو گئے سر! وجہ کیا ہے؟؟"

"وجہ......" اس کا جی بھر آیا وہ اپنی کیفیت کو چھپانے کے لئے چھت کی طرف دیکھنے لگا......اور تھوڑی دیر بعد سنبھلتے ہوئے کہنے لگا......

"آپ کو اس کی وجہ بتاؤں؟"

"ہاں سر! بتائیں نا!" وہ بچہ بول پڑا۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "بیٹھو......میں وجہ بتاتا ہوں"۔

اتنا کہہ کر وہ ایک دفعہ پھر چھت کو گھورنے لگا......وہ چھت کو دیکھتا رہا......دیکھتا ہی رہا......ایک لمبا وقفہ گزرنے کے بعد ایک بچے نے کہا "سر بتائیں نا!"

لیکن استاد کی جانب سے بچے کو کوئی جواب نہ ملا......تب کلاس مانیٹر اٹھ کر استاد کے پہلو میں آیا......اس نے دیکھا کہ استاد مسلسل ٹکٹکی باندھے چھت کو گھورے چلے جا رہا ہے اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں......استاد کی رُوح بدن کے پنجرے سے پرواز کر چکی تھی۔ (ماخوذ)

O

شناخت کا المیہ

O

گارڈن کالج کی طرف جانے والی سڑک کے فٹ پاتھ پہ بیٹھا یہ شخص پوری طرح اپنے حواس میں معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جب اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھا کہ معاملہ کیا ہے تو اس نے میرے دونوں بازو کندھوں سے ذرا نیچا انتہائی سختی سے پکڑ لئے اور آنکھیں پھاڑ کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں نے اُسے کسی ڈراؤنے خواب سے جگا دیا ہو۔۔۔۔ تھوڑی دیر وہ مجھے یونہی خالی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر دوبارہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''بابا جی ہوش کریں۔۔۔۔ صبر کریں۔۔۔۔ اپنے آپ کو سنبھالیں۔۔۔۔ سنیں میری طرف دیکھیں۔۔۔۔ مجھے بتائیں آپ کا مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے گھبرا کر نجانے کیا کیا کہہ دیا۔۔۔۔ میرے دلاسہ دینے پر وہ کچھ سنبھلا۔۔۔۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا لیکن اُس نے مجھے روک دیا اور اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

''۔۔۔۔ بیٹا میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہوں''۔

مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہوا۔ میں خاموشی سے، شرمندگی اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات لئے اُس کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔۔۔۔ چند ثانیے گزرنے کے بعد میں نے پھر اپنا سوال دھرایا۔۔۔۔ ''بابا جی! مسئلہ کیا ہے؟؟؟ آپ اتنے

پریشان کیوں ہیں......اور اس طرح زاروقطار رو کیوں رہے ہیں؟؟"

اتنی دیر میں وہ بھی کچھ سنبھل چکا تھا۔"بات یہ ہے بیٹا کہ آج میری شناخت گم ہوگئی ہے......میں بے شناخت لوگوں میں شامل ہوگیا ہوں"

ایک لمحے کو وہ مجھے پاگل لگا......لیکن اس کی بات چیت اور لہجہ میرے اس خدشے کی نفی کر رہا تھا"وہ کیسے؟؟؟"میں نے پوچھا۔

"اس کی تفصیل خاصی طویل ہے......تمہاری سمجھ میں بھی شاید نہ آئے...... تمہارا وقت قیمتی ہے......میری فضول باتوں میں الجھ کر تم پریشان ہو گے...... چھوڑو......تم نے مجھے دلاسا دیا......تمہاری مہربانی"

"نہیں بابا جی! آپ مجھے اپنا غم بتائیں......میں تفصیل سے سنوں گا...... آپ میری پرواہ نہ کریں......شاید میں آپ کے کسی کام آجاؤں؟"میں نے اپنی مکمل دلچسپی کا اظہار کیا۔

لوگ ہمارے اطراف سے گزر رہے تھے......روڈ پر گاڑیاں اور معمول کی ٹریفک رواں تھی لیکن ہم ان سب سے بے نیاز فٹ پاتھ پر بیٹھے بات چیت کر رہے تھے......کسی کو ہماری پرواہ نہ تھی اور ہمیں کسی سے واسطہ نہ تھا۔

"بیٹا داستان تھوڑی طویل ہے کہیں اکتا نہ جانا......میں نے اگر پوری داستان نہ سنائی تو تمہیں سمجھ بھی نہیں آئے گی اور مجھے اپنا مسئلہ سمجھانے میں دقت ہو گی"بابا نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

"آپ جہاں سے مرضی ہے شروع کریں میں آپ کی داستان سن کر جاؤں گا"میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

''اچھا تو سنو! میں جودھ پور، جواب انڈیا میں ہے، کے ایک قبائلی خاندان میں پیدا ہوا...... ہمارے قبیلے کے لوگ خانہ بدوش اور بھیڑ بکریاں پالنے والے ہوتے ہیں۔ہم چار بہن بھائی تھے اور میں سب سے چھوٹا تھا۔ میں ابھی بمشکل چار یا پانچ سال کا تھا کہ میرے والدین وفات پا گئے۔ مجھے اپنے والدین کا زیادہ پیار نصیب نہ ہو سکا۔میرے بزرگوں نے مجھے سکول نہیں بھیجا حالانکہ مجھے پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور جب میں کچھ باشعور ہوا تو زندگی کے مسائل میں ایسا الجھ کر رہ گیا کہ مجھے اپنے شوق کو قربان کرنا پڑا۔میں اپنی بہنوں سے ساتھ رہتا تھا۔بڑا بھائی ہم سے الگ ہو گیا اور میرا کام بھیڑ بکریاں چرانا تھا۔ میں سارا دن گھنے جنگلوں میں...... وسیع میدانوں اور دشوار گھاٹیوں کے دامن میں اپنے جانور چراتا رہتا۔کبھی اکیلا ہوتا...... کبھی بہنیں ساتھ ہوتیں اور کبھی ہمارے قبیلے کا کوئی اور لڑکا...... جہاں بھی رات ہوتی ہم سو جاتے کبھی اپنی جھونپڑی کے اندر کبھی بکریوں کے باڑے میں اور کبھی کھلے میدان میں...... قبیلے کے بڑے بعض مسئلوں میں ہماری مدد بھی کرتے لیکن بہت سے معاملات میں وہ ہمارا اتنا خیال نہیں رکھتے تھے کہ جتنا کوئی اپنا کرتا ہے۔جنگلوں،میدانوں اور گھاٹیوں میں اپنا ریوڑ لے کر پھرتے پھراتے کئی دفعہ جنگلی درندوں سے بھی واسطہ پڑا لیکن مجھے ڈر بالکل نہیں لگتا تھا...... میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنی بہنوں کا قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے بیاہ کیا...... وہ جب اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں تو میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔میرا اس ماحول سے جی اچاٹ رہنے لگا۔اور مجھے اپنی زندگی کا یہ رنگ ڈھنگ بدلنے کی سوجھی۔ میں اس ماحول سے نکل کر عام لوگوں میں گھل مل کر رہنا چاہتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد میری یہ خواہش یوں پوری ہو گئی کہ مجھے ریاست کے محکمہ ریلوے میں ملازمت مل گئی.....اس وقت میری عمر تقریباً بیس سال تھی۔یوں میں نے قبائلی اور جنگلی زندگی کو خیر باد کہہ دیا اور میری پرانی شناخت جودھ پور کے جنگلوں میں کہیں گم ہو گئی۔"

"بابا آپ نے شادی بھی کی یا....." میں نے ایک سوال اٹھایا۔

"نہیں.....زندگی بھر نہیں" اس نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے قبیلے کے بزرگ چاہتے تھے کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کرلوں.....وہ لڑکی ہمارے قبیلے سے ہی تھی لیکن ان کی شرط تھی کہ میں ریلوے کی ملازمت چھوڑ کر واپس قبیلے میں آ جاؤں اور پھر سے مال مویشی پالنا شروع کردوں.....میں نے انکار کر دیا اور اس طرح اپنے قبیلے کے اندر شادی کا باب میرے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا" وہ سانس لینے کو رکا تو مجھے ایک اور سوال سوجھا۔

"لیکن تم نے کسی دوسری جگہ شادی کیوں نہیں کی؟"

"دراصل زندگی بھر میں مالی طور پر اس پوزیشن میں ہی نہ آ سکا کہ کسی خاندان میں شادی کر کے اپنا گھر بسا سکوں" اس نے افسردہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا آپ ریلوے کی ملازمت کا ذکر کر رہے تھے.....آگے سنائیں؟" میں نے تسلسل جوڑنے کی خاطر کہا۔

"دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک میں نے ریلوے میں ملازمت جاری

رکھی۔ جنگ کے موقع پر سرکاری محکموں سے لوگوں کو فوج میں آنے کی دعوت دی گئی۔ میں بھی فوج میں چلا گیا۔ یوں بطور ریلوے ملازم میری شناخت ایک دفعہ پھر گم ہو گئی ...... لیکن مجھے اس پر دکھ نہیں تھا۔ اب میں ایک فوجی تھا۔ ہمیں برما کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ ہمارا کام محاذ پر مصروفِ پیکار فوجیوں کو راشن اور جنگی سازو سامان پہنچانا تھا۔ گدھوں اور خچروں کے ذریعے مال لے کر سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑی دروں سے گزرنا ایک بہت ہی مزیدار اور دلچسپ تجربہ تھا۔ میں نے دورانِ جنگ وہاں بہت کچھ سیکھا۔"

بابا گزرے لمحات کی حسین اور دلگداز یادوں کے سحر میں کھوتا جا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا اور سانس درست کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"جنگ ختم ہوئی تو ہمیں واپس انڈیا بھیج دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا حالانکہ برما کے محاذ پر میری خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے مجھے طلائی تمغہ دینے کا اعلان بھی ہوا تھا۔ دراصل میں فوج کے ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پایا تھا ...... میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا، معمول سے ہٹ کر ...... کوئی بڑا کارنامہ ...... اگر مجھے

فرنٹ پر لڑنے کا موقع دیا جاتا تو ...... شاید میں کچھ کر گزرتا ...... لیکن میرا اَن پڑھ ہونا ہی میری راہ کا سب سے بھاری پتھر تھا۔"

" قسمت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ ایک دفعہ پھر مجھ سے میری شناخت گم ہو گئی ...... ہوائیوں کی فوج کی ملازمت چھوڑنے کے کچھ عرصہ کے بعد میں نے دوبارہ ریلوے کا محکمہ جائن کر لیا اور اس دفعہ مجھے مستقل ملازمت میں رکھا گیا تھا ...... جون

۱۹۴۷ء میں مجھے لالہ موسیٰ بھیج دیا گیا۔ کیونکہ مجھے اپنی شناخت درکار تھی اور وہ تھی پاکستان...... میں پاکستانی شہری کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانا چاہتا تھا...... ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء کے مبارک دن کروڑوں مسلمانوں کے دل کی دھڑکن پاکستان...... میری شناخت کا حوالہ بن گیا۔"

"اپنی اس نئی شناخت پر میں اپنے ماضی کے سارے غم، ساری تکلیفیں اور محرومیاں بھول گیا...... ملازمت اور مستقبل کے سارے سہانے خواب پورے ہوتے دکھائی دیئے...... مجھے زندگی میں پہلی بار اپنی ملازمت اور وطن سے محبت کا احساس ہوا...... جو میرا ایمان بن گئی تھی"۔

وہ تھوڑی دیر سانس لینے کے لئے رکا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو پاکستان کے نام پر جوش و جذبے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔ بابا نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

"ایک دن اسٹیشن ماسٹر نے مجھے اپنی جیب سے کھانا کھلانے کے لئے کہا...... میری تنخواہ قلیل سی تھی میں نے معذوری ظاہر کر دی اور اپنی مجبوری بھی بتائی...... چند ہفتوں بعد جب میں کچھ دنوں کی چھٹی کے بعد دوبارہ کام پر آیا تو مجھے بتایا گیا کہ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے معطل کر دیا ہے۔ یہ ۱۹۴۸ء کے ابتدائی ایام کی بات ہے۔ میں لاہور میں ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ کے پاس شکایت کی غرض سے گیا جہاں اس کے کلرک نے مجھ سے میرے تمام کاغذات لینے کے بعد اس کام کے عوض دس روپے بطور رشوت مانگے۔ میں نے صاف انکار کر دیا...... اس نے میرے تمام کاغذات اپنے قبضے میں لے کر مجھے دفتر سے نکال دیا...... یوں ایک دفعہ اپنے پاکستان میں مجھ

سے میری شناخت کے تمام ثبوت لے کر گم کر دیئے گئے۔کئی چکر لگانے کے باوجود نہ تو مجھے میرے کاغذات ملے اور نہ ہی میں اپنی شناخت قائم رکھ سکا۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی لیکن اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔" میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میری پاکستانی قوم ---- میرے مسلمان بھائی ---- اتنی جلدی رشوت اور بدعنوانی کی دلدل میں دھنس جائیں گے۔اس طرح میری ریلوے سروس کا تمام ریکارڈ تلف ہو گیا۔میں نے بہت درخواستیں دیں لیکن پٹواری کے خلاف درخواست خواہ صدرِ مملکت کو بھی دی جائے واپس پٹواری کے پاس ہی جاتی ہے۔میرا کچھ بھی نہ بن سکا۔"

"زندگی کرنے کے لئے راولپنڈی ریلوے کی کینٹین پر برتن دھونے کی ملازمت کر لی۔یہ ملازمت روزانہ اجرت پر ملی تھی۔ٹھیکیدار مجھے ہر روز کا ایک روپیہ دیتا ---- تاہم یہ بہت تھا۔ان دِنوں چیزیں سستی تھیں۔چائے کا کپ تین پیسے اور دودھ پتی چھ پیسے میں ملتی تھی ---- روٹی کی قیمت دو پیسے تھی ---- یوں میں نے زندگی کے کم بیش ۳۸ برس کینٹین پر برتن دھوتے گزار دیئے۔اس دوران میں نے برتن دھونا ہی نہ سیکھا بلکہ زندگی نے بہت سے تجربات سے گزرا۔میں نے دکھوں، غموں اور خوشیوں کو برداشت کرنا اور ان سے لطف حاصل کرنا سیکھ لیا۔محنت کرنا سیکھا۔نماز پڑھتا اور دوستوں یاروں کے ساتھ خوش باش زندگی گزارتا رہا۔لوگوں کے رویوں اور زمانے کے چلن میں دن بدن تبدیلی آتی گئی۔دھوکہ دہی، فریب اور لوٹ مار بڑھتی گئی۔امن، محبت اور اخوت کے جذبے مفقود ہوتے گئے۔امیر لوگ امیر سے امیر تر اور غریب لوگ غریب تر ہوتے گئے ---- میں بھی تو محض کینٹین کا ڈش واشر ہی رہا ----

زندگی میں آسودگی نہ آسکی۔تاہم حالات ایک ڈگر پر چل رہے تھے جس کا میں ہر لمحہ شکر ادا کرتا۔"

بابا اپنی داستان سنا رہا تھا اور میں اس ملک،اس کے باشندوں اور نام نہاد عیناؤں کے عروج و زوال کے بنتے بگڑتے ہیولوں میں بھٹکنے لگا۔لوگ ہمارے آس پاس سے دوڑتے بھاگتے گزر رہے تھے۔نجانے انھیں کس بات کی جلدی تھی۔

"چار سال پہلے کی بات ہے" بابے کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میں متوجہ ہوا......

"چار سال پہلے کی بات ہے میں رمضان المبارک کے مہینے میں سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ ایک تیز رفتار کار مجھے روندتی ہوئی گزر گئی۔میری ٹانگوں پر زخم آئے تھے......لوگ مجھے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔تین دن وہاں بے یار و مددگار پڑا رہا۔پہلے روز ایمرجنسی میں میری مرہم پٹی کی گئی اور بعد میں مجھے کسی نے نہ پوچھا۔میری دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں جن کا اپریشن ضروری تھا لیکن مجھے لاوارث اور غریب سمجھ کر میری ٹانگوں پر پلاسٹر تک نہ چڑھایا گیا۔بلکہ تیسرے دن مجھے،میری التجاؤں کے باوجود،ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔میں اپاہج ہو گیا تھا......ہمیشہ کے لئے......میں نے بہت شور مچایا......مدد کے لئے چیخ و پکار کی لیکن میری ایک نہ سنی گئی۔ایک دردمند انسان نے مجھے رکشے میں ڈالا اور ایدھی ہوم لے گیا۔جہاں میرا علاج ہوتا رہا......لیکن دونوں ٹانگیں ناکارہ ہو چکی تھیں......اور یہ مستقل عذاب بن گئیں۔مجھے وہاں رہنے کا بھی کہا گیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔میں اپنی معذوری پر کڑھنے کے بجائے زندگی سے لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔میں واپس کینٹین پر چلا آیا......مگر یہاں تو

میری شناخت ہی نہ تھی۔ کینٹین کا ٹھیکیدار بدل چکا تھا۔ نئے ٹھیکیدار نے مجھے بوڑھا اور اپاہج کہہ کر نوکری دینے سے انکار کر دیا۔ یوں ۳۸ سال بعد ایک دفعہ پھر میری شناخت گم ہوگئی۔"

"آپ واپس ایدھی ہوم کیوں نہیں چلے گئے" میں نے پوچھا۔

"میں وہاں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہاں دنیا سے کٹ کر رہنا اور اپنی معذوری پر کڑھنا مجھے پسند نہیں"

"تو پھر آپ اس طرح بچوں کی طرح روتے کیوں ہیں۔ ہمت کریں۔ اللہ کوئی راستہ نکالے گا" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"میں اس بات پر نہیں رو رہا تھا...... دراصل میں دو تین دن سے فاقے سے ہوں نقاہت اور کمزوری سے جسم میں جان بھی نہیں رہی۔ اس فٹ پاتھ پہ پڑے پڑے نجانے کب آنکھ لگ گئی ...... کسی نے میرا قومی شناختی کارڈ اور جمع پونجی ...... بلکہ سب کچھ لوٹ لیا ہے۔ مجھے پیسوں کا دکھ نہیں...... زندگی میں لاکھوں آئے اور گئے...... مسئلہ میری شناخت کا ہے...... اب میری شناخت ایک دفعہ پھر گم ہوگئی ہے اور اس شناخت کا المیہ یہ ہے کہ میں اب اپنے آپ کو پاکستانی شہری بھی ثابت نہیں کر سکتا"

O

جنگل کا قانون

O

ڈور ایک خیمہ بستی اور اس بستی سے ذرا سا آگے ایک مہیب، گھنا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ دِن ہو یا رات اس جنگل میں درندے چنگھاڑتے رہتے ہیں......اور اُس جنگل کے مکین لوگ جان جانے کے انجانے خوف میں جکڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی جب یہ درندے مضافاتی بستیوں کا بھی رُخ کرتے ہیں تو تباہی مچا کے رکھ دیتے ہیں......مردوں، عورتوں، بچوں، ضعیفوں، جانوروں بھی کا شکار کرتے ہیں......مگر یہ مظلوم و مقہور انہیں روک نہیں سکتے۔ وائلڈ لائف کے قانون کی رو سے اِن شکار پر پابندی ہے اور نایاب نسلوں کا شکار تو بالکل ہی ممنوع ہے۔ دوسری جانب قانون کی خلاف ورزی پر سزا کا خوف کسی تلوار کی طرح ان کے سروں پہ لٹک رہا ہے۔ بس ایک انجانا سا "خوف" ہے جو ذہنوں کو مفلوج اور سوچوں کو جکڑے بیٹھا ہے......اس انجانے خوف سے سب کی زبانیں گنگ ہیں......اِن کی آسمان کی طرف اٹھی نگاہوں میں گویا حیرتوں کی ریت بھر گئی ہے......اِن کے دُعا کے لئے اٹھنے والے ہاتھ شل ہو چکے ہیں۔ زبانوں کے بجائے دِلوں سے نکلنے والی آوازیں بھی جنگل کے شور میں گم ہو جاتی ہیں۔ اِنہیں کون بتائے کہ اسی ماحول میں......اور یہیں پہ رہنا اِن کا مقدر ہے۔

دوسری جانب شہر کے باسیوں کا حال یہ ہے کہ شہر کی مصروف ترین زندگی

اور اُس کے مہیب دُکھ اِن کا مقدر ہیں۔نانِ جویں کی تلاش وجستجو میں اِن کا پورا دِن، زیست کونکھارنے سنوارنے کی خاطر بھاگتے، ہانپتے، کانپتے گزر جاتا ہے اوران کی راتیں تو گویا بے خواب سی رہتی ہیں۔تھکن سے چور بدنوں والے یہ لوگ......ذہن کی تختی پہ بچی دوسرے دِن کی صعوبتیں شمار کرتے کرتے نیند کی گود میں جا گرتے ہیں۔اِن کی بے سکون اور بے خواب نیند، جو sleeping pills کی مرہونِ منت ہے......اِنہیں کیا سکون دے گی۔یہ تو کھلی آنکھوں ڈراؤنے خواب دیکھنے کے عادی ہیں اور اِن کی جاگتی آنکھوں میں کئی سپنے اٹک کر رہ گئے ہیں۔یہ امن، سکون اور سلامتی کو ترس گئے ہیں۔

درندوں کے درمیان رہنے والے جنگل کے باسی اپنی مفلوج سوچوں اور مایوس ذہنوں کے ساتھ شہر کی جانب جانے والے رستے پہ نظریں جمائے بیٹھے ہیں کہ نجانے کب کوئی مسیحائی کو پہنچ جائے اور انہیں درندوں کی سفا کی سے چھٹکارا نصیب ہو۔

شہر والوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ انسانوں کے اس جنگل میں روزانہ ہر ایک سمت سے خوف کے ناگ زہریلے پھن پھیلائے ان کا پیچھا کرتے ہیں۔کبھی کبھی تو خوف کا یہ زہر اِن کی نس نس میں بھر املتا ہے۔انہیں ہر لحظہ اپنے وجود کی سلامتی کا دھڑ کا لگا رہتا ہے۔دِن کی روشنی میں بھی، شہر کی مصروف ترین سڑکوں پر، بھیڑ میں گم بازاروں میں، یہ اپنے آپ کو بے امان سمجھتے ہیں اور ان بے اماں گلی کوچوں سے گزرتے وقت انہیں ایک انجانا سا خوف دامنگیر رہتا ہے۔ان کے ضعیف

ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچے سبھی گھر میں اکیلے ہیں۔ بچے سکول بھی گئے ہیں----خدا خیر کرے!! کسی اٹھائی گیرے----ڈاکو----بدمعاش ----یا لٹیرے کی نظر اُن پر نہ پڑ جائے۔ اسی خوف کے ہاتھوں وہ گھٹ گھٹ کے مر رہے ہیں اور اسی خوف کا مرض ان کے ذہنوں میں سرایت کر گیا ہے۔ اشیائے صرف کا یہ حال ہے کہ اول تو یہ اُن کی قوتِ خرید سے ہی باہر ہیں اور اگر کہیں سے وسائل دستیاب ہو بھی جائیں تو بازار میں جنس نایاب ہے۔ ہاتھ میں پیسے تھام کر جانے والے کی صحیح سلامت واپسی کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں۔ یہ لوگ اپنے ہی گھروں کے سامنے خودکشی پر مجبور ہیں۔ یہ ہجرت بھی نہیں کر سکتے کہ اسی شہر میں ان کا رزق بکھرا پڑا ہے جو انہوں نے ذرہ ذرہ کر کے اپنی پلکوں سے سمیٹنا ہے۔

معزز درباریوں کے حصار میں بیٹھے کوتوالِ شہر کی نگاہوں پر کس کر پٹی باندھ دی گئی ہے۔ وہ بے اختیار ہر گز نہیں مگر خوف کے مرض میں مبتلا لگتا ہے یا پھر کچھ ایسا ہے کہ اس کی مشکیں اسی خوف نے کس رکھی ہیں۔ اس کے حواری درباری اسے "سب اچھا" کی مسلسل تھپکی دے کر پرسکون نیند کی وادی میں بھیج دیتے ہیں یا پھر اُس کے بلند اقبال کا ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں۔ مگر خوف ہے کہ ہر ایک ذہن کو اپنے آہنی شکنجے میں کسے جا رہا ہے۔ کوتوالِ شہر کو کبھی کبھی اپنے محل کے دریچوں سے مبہم سا شور اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب اُس کی نیند اُچاٹ ہوتی ہے یا بلند اقبال کا نشہ ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے تو وہ محل کے جھروکے سے ہی یا کسی بالکونی پر آ کر عوام الناس سے کہتا ہے----لوگو آؤ! خوف کے خلاف آواز اٹھاؤ----کٹہرے میں کھڑے ہو کے بے دھڑک گواہی دو

دو...... میں تمہاری ہر پریشانی کا سدِ باب کرنے کو تیار ہوں۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اُسے خوف کے خلاف پورے شہر سے ایک بھی تو گواہ میسر نہیں۔ اور کوتوال کے درباری ہیں کہ خوف کو محض ایک ''واہمہ'' قرار دینے پہ بضد ہیں...... جب خوف کے خلاف کوئی شہادت میسر نہیں تو قاضی شہر بھی مجبور ہے کیونکہ عدالتیں تو خوف کے خلاف بھی زندہ ثبوت مانگتی ہیں...... لہٰذا شہر کے گلی کوچوں اور جنگل کے کونے کونے میں منادی کرائی گئی ہے کہ جب تک خوف کے خلاف کوئی گواہ میسر نہیں آتا یا وہ از خود گرفتاری نہیں دے دیتا تب تک پوری ریاست کی حدود میں ''جنگل کا قانون'' ہی چلے گا۔

O

